اُردو (لازمی)

برائے

انٹرمیڈیٹ سال اول

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اُردو

(لازمی)

گیارہویں جماعت کے لیے

پبلشر: نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ، کوئٹہ

اپیل!

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ طلبہ کے لئے نصاب کے تحت معیاری درسی کتب کی تیاری پر مامور ہے۔ بورڈ اس سلسلے میں نامور ماہرین کی خدمات سے استفادہ کرتا ہے۔ اگرچہ کتابوں کے مواد اور معیار کو بہتر بنانے کے لئے مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی بہتری کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ غلطیوں کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس پس منظر میں گزارش ہے کہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ درسی کتب کے معیار کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

سید عارف شاہ شیرازی

چیئرمین

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

فون/فیکس نمبر:081-2470501

ای میل:btbb_quetta@yahoo.com

جملہ حقوق بلوچستان بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں

منظور کردہ صوبائی محکمہ تعلیم حکومت بلوچستان کوئٹہ، بمطابق قومی نصاب 2006ء اور نیشنل ٹیکسٹ اینڈ لرننگ پالیسی 2007ء ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم اینڈ ایکسٹینشن سینٹر بلوچستان کوئٹہ بحوالہ مراسلہ نمبر CB/05-1002 مورخہ 07 اکتوبر 2016ء۔ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ اور ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی امدادی کتاب یا گائیڈ وغیرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

نصابی کتاب ...... اُردو (لازمی) گیارہویں جماعت کے لیے

مرتبین ......(۱) پروفیسر حمید اللہ جلال زئی (ایم۔اے اُردو، یونیورسٹی آف پنجاب ۱۹۶۹ء)
سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی

(۲) شوکت ترین (ایم۔اے اُردو، ایم۔اے پشتو، ایم۔ایڈ)
ماہرِ مضمون گورنمنٹ کالج آف ایلیمنٹری ایجوکیشن لورالائی

مدیر ...... پروفیسر ڈاکٹر عرفان احمد بیگ (شعبہ اُردو تعمیرِ نو پبلک کالج کوئٹہ)

☆ انٹرنل ریویو کمیٹی

- پروفیسر اللہ داد خان نیازی
  پرنسپل اقراء ریذیڈنشل کالج کوئٹہ
- پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک
  صدر شعبہ اُردو یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ
- عبدالرازق اُلفت
  اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو) گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ
- بشریٰ تحسین
  سینئر ماہرِ مضمون گورنمنٹ کالج آف ایلیمنٹری ایجوکیشن (خواتین) پشین
- سید نائب جان آغا (ماہرِ مضمون و کوآرڈینیٹ آفیسر بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ)

☆ پراونشل ریویو کمیٹی

- گلاب خان مندوخیل
  (چیئرمین) ناظم تعلیمات، ادارۂ نصابیات کوئٹہ
- پروفیسر عبدالقیوم تارن
  اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج خانوزئی
- اسفندیار بادینی
  اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کوئٹہ
- پروفیسر امجد حسین اعوان
  اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ انٹر کالج کچلاک
- پروفیسر زیب النساء لونی
  اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج کوئٹہ کینٹ
- سید نائب جان آغا
  ماہرِ مضمون، ادارۂ نصابیات و مرکزِ توسیع کوئٹہ
- پروفیسر عبدالخالق بغلانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر (کوآرڈینیٹر) ادارۂ نصابیات و مرکزِ توسیع کوئٹہ

- لے آؤٹ :...... محمد امجد قادری
- تیار کردہ :...... نیو کالج پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) کوئٹہ
- پبلشر: :...... نیو کالج پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) کوئٹہ
- نگران طباعت :...... بہاؤالدین کاکڑ

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
	حصہ نظم		
۱۷	حمد	ماہر القادری	۱۲۶
۱۸	نعت	محسن کاکوروی	۱۳۰
۱۹	انجام	نظیر اکبر آبادی	۱۳۴
۲۰	داستان۔ تیاری میں باغ کی	میر حسن	۱۳۹
۲۱	غربت	میر انیس	۱۴۴
۲۲	شہادت حضرت علی اصغرؓ	مرزا دبیر	۱۴۹
۲۳	مسلمانوں کا تابناک ماضی	مولانا حالی	۱۵۵
۲۴	قومی	اکبر الہ آبادی	۱۵۹
۲۵	شام	حفیظ جالندھری	۱۶۵
۲۶	ایبسٹریکٹ آرٹ	سید محمد جعفری	۱۷۰
۲۷	ریل کا سفر	سید ضمیر جعفری	۱۷۴
۲۸	گل بہار کالونی	مرزا محمود سرحدی	۱۷۸
	حصہ غزل		
	جس سر کو آج غرور ہے یاں تاجوری کا	میر تقی میرؔ	۱۸۲
	تھا عشق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں	میر تقی میرؔ	۱۸۳
	ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	مرزا غالبؔ	۱۸۷
	ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور	مرزا غالبؔ	۱۸۸
	فرصت زندگی بہت کم ہے	میر دردؔ	۱۹۲
	نہ گیا کوئی عدم کو دل شاداں لے کر	غلام ہمدانی مصحفیؔ	۱۹۸
	اِن آنکھوں نے کیا کیا تماشہ نہ دیکھا	مرزا داغؔ	۲۰۳
	فرہنگ		۲۰۶

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف
	حصہ نثر	
۱	نظریہ پاکستان	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
۲	گزرا ہوا زمانہ	سر سید احمد خان
۳	نئی دہلی کی ایک تعمیر	مولوی محمد ذکاء اللہ
۴	ادب کیا ہے	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
۵	تنقید میں توازن	ڈاکٹر عبادت بریلوی
٦	آبادی اور منصوبہ بندی	مؤلفین
	ناول	
۷	تباہی، تباہی، تباہی	رتن ناتھ سرشار
۸	آنگن	خدیجہ مستور
	ڈرامہ	
۹	رستم و سہراب	آغا حشر کاشمیری
۱۰	مرزا غالب بندر روڈ پر	خواجہ معین الدین
	سفر نامہ	
۱۱	چلتے ہو تو چین کو چلیئے	ابنِ انشاء
۱۲	بابل کے کھنڈرات	جمیل الدین عالی
	مکاتیب	
۱۳	خطوط غالب	مرزا غالب
۱۴	مکاتیبِ اقبال	علامہ اقبال
	پاکستانی ادب	
۱۵	کلام مست توکلی	ترجمہ: ڈاکٹر شاہ محمد مری
۱٦	نیکی و بدی	سید عابد شاہ عابد

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

(حالاتِ زندگی)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ۱۹۱۲ء کو گلاب خان کے ہاں جبل پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ ایم۔اے اُردو، ایم۔اے فارسی، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۸ء ناگ پور یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کے صدر رہے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو میں صدر شعبہ اُردو بنے اور ۱۹۷۲ء میں ملازمت سے سبکدوشی تک اس عہدے پر فائز رہے۔ بعد ازاں اسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر تعینات ہوئے۔

تمام عمر اُردو سے وابستہ ہو کر ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ آپ کے متعدد مضامین آپ کی اسلام اور وطن سے محبت کے غماز ہیں۔ علم و ادب کے فروغ میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کی درجنوں تصانیف آئندہ لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے علاوہ ان کے روحانی فیض سے بھی اہلِ وطن مستفید ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں آپ کی تحقیقی و تنقیدی تصانیف کی تعداد ستر سے زائد ہے۔ حالی کا ذہنی ارتقا، علمی نقوش، فارسی پر اُردو اثر، ادبی جائزے، تحریر و تقریر، ترجمہ قرآن پاک مخدوم نوح ہالائی، دیوان روشن، حضرت مجدد الف ثانی، گلشن وحدت، مکتوبات سیفیہ، مکتوبات معصومیہ، اقبال اور قرآن، معارف اقبال، ہسٹری آف بہرام شاہ (انگریزی)، برصغیر پاک و ہند میں فارسی ادب (انگریزی)، ثقافتی اُردو قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے ۲۰۰۵ء میں حیدر آباد (سندھ) میں وفات پائی۔

نظریۂ پاکستان

(ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کروانا۔
- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اسلوب نثر سے متعارف کروانا۔

الفاظ و تراکیب

باہمی اتفاق	انتشار	مفاہمت	عناد	شُدھی
ترویج و اشاعت	رواداری	زک	فریب	سنگھٹن

مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری کو اپنا شیوہ بنایا ہے لیکن جب کفر و الحاد اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو مسلمان اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اکبر کی بے جا رواداری اور ملکی سیاست میں ہندوؤں کے عمل دخل کی وجہ سے ملک میں کافرانہ طور طریقے اس قدر رائج ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کی آزادی خود اس کے دینی معاملات میں بھی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اکبر کے آخری دور میں اسلام کی سربلندی کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ کھڑے ہوئے۔ آپ نے جہانگیر کے زمانے میں محض دین کی خاطر قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اسلامی قدروں کو نئے سرے سے فروغ دیا۔ اس کے اثر سے شاہ جہاں اور اس کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب، دین کا خادم بنا، لیکن اورنگ زیب کے بعد ہی اس کے بیٹوں کے باہمی نفاق اور کمزوری کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ مرہٹوں اور ہندوؤں کے کئی گروہوں نے سر اٹھایا۔ انگریزوں نے اپنے قدم جمائے اور ملک میں انتشار پھیل گیا لیکن ایسے گئے گزرے حالات میں بھی قوم کو فروغ دینے اور اسلام کو سربلند کرنے کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ چنانچہ میسور کے سلطان حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں کا مقابلہ کیا بلکہ افغانستان، ترکی اور پھر فرانس کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی لیکن ملک کے دوسرے سرداروں نے ساتھ نہیں دیا اور انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے صاحبزادوں نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی تحریک شروع کی پھر ان کے پوتے شاہ اسماعیلؒ نے اپنے مرشد سید احمد بریلویؒ کے ساتھ اسلامی اصولوں کو دوبارہ رائج کرنے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش میں ۱۸۳۱ء میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تاہم انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے پھر اپنے قدم جمانے کی کوشش کی لیکن انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا۔ اس لیے انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں سرسید نے مجبوراً

انگریزوں سے مفاہمت کو غنیمت جانا اور مسلمان قوم کی اخلاقی اور تہذیبی اصلاح پر توجہ دی اور ان کے دلوں سے احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوؤں نے کانگریس کی بنیاد ڈالی اور ظاہر یہ کیا کہ وہ ملک کی تمام قوموں کو ان کے حقوق دلوائیں گے۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ صرف اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے کاروبار سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی اور وہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہوگئے۔ نیز انھوں نے مسلمانوں کی مشترکہ زبان اُردو کے مقابلے میں ہندی کو قائم کردیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس کانگریس اور ان کی سیاست سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور ان کے ایک دوست مولانا محمد قاسمؒ نے دیوبند میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ پھر سرسید کے ایک رفیق نواب وقار الملک نے ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ تنظیم ڈھاکے میں قائم ہوئی تھی جہاں ہندوؤں نے سازش کر کے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے مشرقی بنگال اور آسام کا وہ صوبہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ختم کرادیا اور ۱۹۱۱ء میں اسی علاقے کو پھر بنگال میں شامل کرادیا۔

اسی زمانے میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی، جس میں انگریز کا مقابلہ جرمنی سے ہوا اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان چونکہ ترکی کے سلطان کو حجاز کی خدمت کرنے کی وجہ سے خلیفۂ اسلام سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے مالی اور طبی امداد بہم پہنچائی۔ جس کی وجہ سے حکومت برطانیہ کو مسلمانوں سے عناد پیدا ہوگیا۔ لیکن انھوں نے یہاں کے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا کہ ہمیں اس جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی تو ہم کسی طرح بھی ترکی کو مزید نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہ وعدہ محض فریب تھا۔ چنانچہ جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تو وہ اپنے وعدے سے پھر گئے اور انھوں نے ترکی کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ یہاں کے مسلمانوں کو فریب کی وجہ سے بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے مولانا محمد علی جوہرؒ اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علیؒ کی رہنمائی میں تحریک خلافت شروع کی۔ لیکن اسی زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے شُدھی کی تحریک شروع کی اور ان کو ختم کرنے کے لیے سنگھٹن کی تحریک بھی شروع کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے جو نہرو رپورٹ شائع کی۔ اس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی کا اصول جو وہ بارہ سال پہلے تسلیم کرچکی تھی، بالکل نظر انداز کردیا۔ پھر تو مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا اور انھیں یقین ہوگیا کہ چونکہ ان کا دین، ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت سب کچھ غیر مسلموں سے مختلف ہے، اس لیے کسی حالت میں ہندوؤں سے تعاون نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد والے اجلاس میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن (پاکستان) بنانے کی تجویز پیش کی۔ چار سال کے بعد جب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ مستقل طور پر قبول کیا تو انھوں نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع

کر دی۔ آخر کار ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو انھوں نے لاہور کے اجلاس میں واضح طور پر اعلان کر دیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ایک آزاد مسلم ریاست قائم کی جائے۔ اس اعلان کو ''قراردادِ پاکستان'' کہتے ہیں۔ جس کی رو سے مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا میں قومیت کی تشکیل کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک وہ جو مغربی مفکرین نے قائم کی ہے، دوسری وہ جو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی قائم کی ہوئی ہے۔ اہلِ مغرب نے خاندانی، نسلی اور قبائلی بنیادوں میں ذرا وسعت پیدا کر کے قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود پر استوار کیں اور کہا کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس نظریے کی وجہ سے دنیا کے انسانوں کے درمیان تباہی کا جو دروازہ کھلا وہ دو عالمی جنگوں کے ہونے سے بخوبی ظاہر ہے۔ یہ وطنی قومیت ہی کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور یہ وطنی قومیت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو تحفظ دینے میں تو بالکل ہی ناکام تھی کیونکہ جنوبی ایشیا کے مسلمان اس نظریے کے تحت ایک مجبور اقلیت بن جاتے۔

قومیت کی دوسری بنیاد وہ ہے جو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ملت اسلامیہ کی تشکیل کرتے وقت قائم فرمائی اور جو مغرب کے تصور قومیت سے جدا ہے، جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے بھی فرمایا ہے:

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے جو لا الٰہ الا اللہ پر قائم ہے، یعنی یہ کہ نسل، رنگ اور وطن کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک نظریے، ایک عقیدے، ایک کلمے کی بنیاد پر وجود میں آئی۔ اس نظریاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے اسے ملت کہا گیا ہے۔ ایسی نظریاتی قومیت میں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر جغرافیائی خطے کے لوگوں کے لیے جگہ ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو جن میں ہر نسل، ہر رنگ اور مختلف جغرافیائی خطوں کے لوگ شامل تھے، ایک ایسی قوم کے ماتحت اقلیت بن کر رہنا منظور نہ تھا جو اسلامی قومیت کے برعکس ذات پات، چھوت چھات اور بت پرستی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جداگانہ قومیت یعنی اسلامی قومیت کی بنیاد پر اپنے لیے ایک جدا

وطن کا مطالبہ کیا۔ جس میں وہ اپنے عقیدے، اپنے نظریۂ زندگی، اپنے طرزِ معاشرت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے دورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔

ہمیں اس بات کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ نظریۂ پاکستان میں اسلامی زندگی اور قدروں کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اخوت، مساوات، عدل، دیانت، انسانی ہمدردی اور عظمتِ کردار کے بغیر نظریۂ پاکستان کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ نظریۂ پاکستان کا مقصد محض ایک حکومت قائم کرنا نہیں تھا کیونکہ مسلمانوں کی حکومتیں ایشیا اور افریقہ میں پہلے سے موجود تھیں۔ نظریۂ پاکستان کا مقصد اسلامی اصولوں کی ترویج و اشاعت اور اہلِ عالم کے لیے مثالی مملکت کا نمونہ فراہم کرنا ہے۔

پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہندوؤں کو بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ مملکت قائم نہ ہونے پائے۔ ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ جنوبی ایشیا میں ان کی اکثریت تھی لیکن چونکہ قیامِ پاکستان کا مطالبہ حق اور انصاف پر مبنی تھا اس لیے حکومت برطانیہ کو مجبور ہونا پڑا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی پُرخلوص قیادت، مسلمانوں کے یقین، اتحاد اور عمل پیہم کی وجہ سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

پاکستان نے اپنے قیام سے اب تک بڑی ترقی کی ہے اور اس کا شمار دنیا کے اہم ملکوں میں ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان اور زیادہ ترقی کرے اور ہمیشہ ترقی کرے تو ہمیں نظریۂ پاکستان کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔ اس کی بدولت ہم پاکستان کو زیادہ مستحکم اور شاندار بنا سکتے ہیں۔

نظریۂ پاکستان کا مقصد پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بنانا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ ہمارا جینا اور مرنا پاکستان کے لیے ہونا چاہیے۔ قومی مفاد کے سامنے ذاتی مفاد کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ ہر قسم کی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر تمام پاکستانیوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنا نظریۂ پاکستان کو فروغ دینا ہے۔ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان کو پیشِ نظر رکھا اور اپنی سیرت اور کردار کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تو دنیا کی دوسری قوموں میں بھی ہمیں امتیاز حاصل ہوگا اور ہم اسلامی اصولوں کی روشنی میں پاکستان کو توانا، مستحکم، شاندار اور پُرعظمت بنانے میں پوری طرح کامیاب ہونگے۔ انشاء اللہ

(گلشن وحدت)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) اکبر بادشاہ کی بے جا رواداری کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ب) دنیا میں قومیت کی تشکیل کی دو بنیادیں کونسی ہیں؟

ج) سرسید احمد خان نے انگریزوں سے مفاہمت کیوں کی؟

د) پہلی جنگِ عظیم میں مسلمانوں نے ترکی کا ساتھ کیوں دیا؟

ہ) نہرو رپورٹ کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا؟

و) حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے مطابق ملت کی بنیاد کیا ہے؟

ز) نظریۂ پاکستان کا مقصد کیا تھا؟

۲۔ متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) مسلمانوں کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے:

(i) عدل و انصاف (ii) خدمت

(iii) عبادت (iv) رواداری

ب) سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی انگریزوں کے خلاف ناکامی کی وجہ:

(i) اسلحہ نہ ہونا (ii) فوج نہ ہونا

(iii) سرداروں کا ساتھ نہ دینا (iv) نااتفاقی

ج) کانگریس کا قیام عمل میں آیا:

(i) ۱۸۸۰ء (ii) ۱۸۸۲ء

(iii) ۱۸۸۳ء (iv) ۱۸۸۵ء

د) اہلِ مغرب نے قومیت کی بنیادیں حدود پر استوار کیں:

(i) جغرافیائی (ii) لسانی

(iii) نسلی (iv) مذہبی

ہ) نظریۂ پاکستان میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے:

(i) اسلامی زندگی اور قدریں (ii) انسانی ہمدردی

(iii) اخوت اور مساوات (iv) اتحاد و یکجہتی

۳۔ اس سبق کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درست کی نشاندہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) شاہ اسماعیلؒ، سید احمد بریلویؒ کے مرشد تھے:

ب) مسلم لیگ کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں رکھی گئی۔

ج) پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کا ساتھ دینے پر حکومت برطانیہ کی مسلمانوں سے دوستی بڑھ گئی:

د) تحریک خلافت نواب وقار الملک کی رہنمائی میں شروع کی گئی۔

ہ) نظریۂ پاکستان کا مقصد اسلامی اصولوں کی ترویج و اشاعت ہے۔

۵۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہ میں درست لفظ لکھیں۔

الف) مسلم لیگ .... میں قائم ہوئی تھی۔ (کراچی۔ دہلی۔ ڈھاکہ)

ب) ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں پاس ہونے والی قرارداد .... کہلاتی ہے۔

(قراردادِ مقاصد۔ قراردادِ پاکستان۔ قراردادِ برصغیر)

ج) پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ ہندوؤں کو بہت .... گزرا۔

(ناگوار ۔ خوش گوار ۔ پسندیدہ)

د) جنوبی ایشیا میں آبادی کے لحاظ سے .... زیادہ تھے۔ (مسلمان۔ عیسائی۔ ہندو)

ہ) ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے .... تحریک شروع کی۔ (شدھی۔ سنگھٹن۔ خلافت)

۶۔ سیاق وسباق کے حوالے سے ذیل متن کی تشریح کیجیے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے .... ایک مجبور اقلیت بن جاتے۔

۷۔ درج ذیل محاورات وتراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

قدم جمانا۔ غلبہ حاصل کرنا۔ زِک پہنچانا۔ سر اٹھانا۔ عملی جامہ پہنانا۔

تلخیص نگاری تلخیص نگاری کو مختصر نویسی بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے (PRECIS) کہتے ہیں۔ کسی طویل عبارت، تقریر یا تحریر کو اس کی اصل طوالت سے کم کر کے بیان کرنا تلخیص نگاری کہلاتا ہے۔ مگر تلخیص میں اصل عبارت کے اہم نکات کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ تلخیص عموماً اصل عبارت کا ایک تہائی ہوتی ہے اور اِسی کو تلخیص نگاری کہا جاتا ہے۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلباء کو مختلف اقسام کی علمی تحریروں کے بارے میں بتا کر کالج کی لائبریری میں ان اقسام کی تحریروں کو تلاش کرنے میں مدد دیں۔

۲) اساتذہ کرام طلباء سے روزمرہ زندگی کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں عمومی مضامین تحریر کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ ہمیں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

۲۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ ہمیں نظریۂ پاکستان کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی سیرت اور کردار کی تعمیر کرنی چاہیے۔

۳۔ طلبہ کو مسلم قومیت اور مغربی قومیت کے درمیان فرق مثالوں کے ذریعے بتایا جائے۔

۴۔ طلبہ کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اسلوبِ نثر کی خصوصیات بتائی جائیں۔

سرسید احمد خان

(حالاتِ زندگی)

آپ کا اصل نام سید احمد خان تھا۔ وہ ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے والد سید محمد تقی ایک درویش صفت انسان تھے۔ سرسید کی والدہ دین دار اور باشعور خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی بہت اچھی تربیت کی۔ ان کو اپنے والد کے تعلق کی بناء پر مرزا غالب کی قربت حاصل تھی اس طرح اُنھیں اپنے دور کے اہل علم حضرات سے علم حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔

سرسید نے ۱۸۳۸ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور مختلف عہدوں پر خدمات سرانجام دیتے ہوئے ''سب جج'' کے منصب تک جا پہنچے۔ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ بعد میں یہی کالج ترقی کر کے یونیورسٹی میں تبدیل ہوا جو آج تک قائم ہے۔ اس کالج کے طلبہ نے آزادی اور ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی دیگر خدمات میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء بھی ہے، جس میں مذہبی، قومی، اخلاقی اور سیاسی موضوعات پر مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔

سرسید ایک ہمدرد دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف مصلحِ قوم، عالمِ دین اور سیاسی رہنما تھے بلکہ اُردو ادب کے محسن بھی تھے۔ انھوں نے دبستانِ سرسید کی بنیاد ڈالی۔ جس میں حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، نواب محسن الملک اور وقار الملک جیسے عالم و فاضل شامل تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی، روانی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ وہ بات کو اُلجھا کر بیان نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادھے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جس طرح عام لوگ گفتگو کرتے ہیں وہ اس طرح لکھتے جاتے ہیں۔ اُن کے بعض فقرے بے حد طویل اور بعض بالکل مختصر ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سادگی کے ساتھ ادبی حسن بھی پایا جاتا ہے۔ ''آثار الصنادید''، رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند''، جامِ جم، کلمۃ الحق اور خطباتِ احمدیہ، ان کی اہم تصانیف ہیں۔ برطانوی حکومت نے انھیں ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے صلے میں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔ اُن کا انتقال ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں ہوا۔

گزرا ہوا زمانہ

(سر سید احمد خان)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو فنِ نثر نگاری سے متعارف کرانا۔
- اُردو ادب میں نثر نگاری کی روایت بتانا۔
- اُردو زبان کے لیے سر سید احمد خان کی خدمات سے طلبہ کو آگاہی دینا۔
- سر سید احمد خان کے اسلوب نثر سے متعارف کروانا۔

الفاظ و تراکیب

ڈراؤنی رات	رسیلی آنکھیں	ٹٹول ٹٹول کر	کج خلقی	سڈول ڈیل
اکیلا پن	اُدھیڑ پن	جوبن	بے مروتی	سعی

برس کی آخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے، مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر، نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک پر اور نہ آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اُس کو یاد آتا ہے، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے، ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا "ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا"۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "آہ ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔

آہ وقت گزر گیا! آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ''ابھی وقت بہت ہے''۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے، درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنیاں ٹوٹتی ہیں، تب وہ چلاّ کر بولا ''ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات''۔ یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا! وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے؟ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی ہیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ''ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا، اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو''

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں،

مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا ''ہائے وقت، ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟''

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟ وہ بولی ہاں ہے، نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی اللہ کے فرض کو اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ ''وَاللّٰہِ لَا اَزِیدُ عَلٰی ھٰذَا وَلَا اَنْقُصُ''☆ ادا کر کے انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل درنسل آخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکواۃ اسی تک ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہوجاتی ہیں، مگر انسان کی بھلائی آخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے، کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہوگئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی، قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی اغراض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا اللہ کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا آخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی، تب وہ نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہوکر چلا اٹھا ''ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بُلا سکتا ہوں؟

☆ ترجمہ: اللہ کی قسم میں اس پر نہ اضافہ کروں گا اور نہ اس میں کمی کروں گا۔

ہائے میں دس ہزار دینار دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہوسکتا"۔ یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہوگیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس کو گلے لگا کر پیار کیا۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہوگیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ، او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے، میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ اواللہ، اواللہ، تو میری مدد کر، آمین!"

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو، اور اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تاکہ آخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ، ہمارا زمانہ تو آخیر ہے، اب اللہ سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین!

(مضامین سرسید مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)

مشق

ا) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) جب بڈھے کو پچھلا زمانہ یاد آتا تھا تو وہ کیسا محسوس کرتا تھا؟

ب) بڈھے نے اپنی زندگی کو ایک ڈراؤنی رات سے کیوں تشبیہ دی؟

ج) بڈھے کو جوانی میں ماں باپ کس قسم کی نصیحت کرتے تھے؟

د) مصنف سبق کے آخر میں کیا رائے قائم کرتا ہے؟

ہ) نثر پارہ "گزرا ہوا زمانہ" سے آپ کیا سبق حاصل کرتے ہیں؟

۲) متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) بڈھے کی غمگین ہونے کی وجہ ہے۔

(i) اکیلا پن (ii) اندھیری رات

(iii) بجلی کی کڑک (iv) ان میں سے کوئی بھی نہیں۔

ب) ''گزرا ہوا زمانہ'' تصنیف ہے۔

(i) ڈاکٹر عبادت بریلوی (ii) سرسید احمد خان

(iii) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (iv) ڈاکٹر سید عبداللہ

ج) جب بڈھا دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات دیکھ رہا تھا تو یکا یک اس کو دکھائی دی۔

(i) روشنی (ii) تارے

(iii) چاند (iv) ان میں سے کوئی بھی نہیں

د) بڈھے کی عمر ہے۔

(i) ترپن برس (ii) پچپن برس

(iii) ستاون برس (iv) اُنسٹھ برس

ہ) انسان کے آخر دم تک رہنے والا عمل اُس کی!

(i) عبادت ہے (ii) ہمدردی ہے

(iii) بھلائی ہے (iv) نیکی ہے

۳) متن کے مطابق دُرست کی نشاندہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) بڈھا بڑھاپے میں لڑکپن کے مقابلے میں ہر قسم کی پریشانیوں سے آزاد ہوتا تھا۔

ب) بڈھا اپنے کمرے میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ج) بڈھے نے تمام نیک کام ثواب کی لالچ میں کیے۔

د) اُس کے تمام کام ذاتی اغراض پر مبنی تھے۔

ہ) لڑکا دراصل خواب دیکھ رہا تھا۔

۴) متن کے مطابق کالم (الف) کا متابلہ کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے کر کے جواب کالم (ج) میں لکھیں۔

(الف)	(ب)	(ج)
بجلی	چلنا	....
دل	چھانا	....
دم	کڑکنا	....
گھٹا	جلنا	....
آندھی	کانپنا	....
	گھٹنا	....

۵) سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۷) درج ذیل پیراگراف کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کریں۔

اتنے میں اُس کو اپنے ماں باپ ....اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

۸) اگر آپ بڈھے کی جگہ ہوتے تو کیا سوچتے؟

۹) بڈھے کے بچپن اور بڑھاپے کا موازنہ کریں۔

۱۰) درج ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھ کر جملوں میں استعمال کریں۔

ڈراؤنی رات۔ کج خلقی۔ اُدھیڑپن۔ گھٹا۔ بے مروتی

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام کمرہ جماعت میں طلبہ کو مختلف موضوعات پر کہانیاں، مکالمے سُنا کر اُن سے ان کی جزئیات کو ترتیب سے یاد رکھنے کا کہہ کر بعدازاں اُن سے لکھوائیں۔

۲) کوئی بھی کہانی/مضمون/مکالمہ درمیان سے شروع کر کے طلبہ سے اس کے سیاق و سباق کو سمجھا کر لکھوائیں۔

۳) اساتذہ کرام کمرہ جماعت میں سرسید احمد خان کے چند دیگر مضامین بھی طلبہ کو سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو فنِ نثر نگاری کے مختلف لوازمات پر سیر حاصل لیکچر دیں۔

۲) اُردو زبان و ادب میں سرسید احمد خان کے مقام پر بحث کریں۔

۳) طلبہ کو سرسید احمد خان کی نثری خصوصیات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بتائیں۔

مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی

(حالاتِ زندگی)

مولوی محمد ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان کے شہر غزنی سے تھا۔ جہاں سے وہ ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام کے بعد دہلی جا کر مستقل سکونت اختیار کی۔ جہاں آپ کے دادا ایک مغل شہزادے کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ بچپن ہی سے نہایت قابل اور ذہین تھے۔ چھ سال کی عمر میں اپنے دادا مولوی محمد بقا اللہ سے ''گلستان سعدی'' پڑھنا شروع کی۔ بارہ سال کی عمر میں قدیم دہلی کالج میں داخلہ لیا۔اپنی قابلیت کے باعث متعدد بار کالج میں نقد انعامات اور وظیفہ حاصل کیا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے استاد تعینات ہوئے۔ پھر بلند شہر کے ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز مقرر ہوئے۔۱۸۷۲ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔۲۶ برس ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

تعلیم نسواں کی خدمات کے صلے میں حکومت سے خلعت پایا۔علمی اور تاریخی خدمات کی وجہ سے پندرہ سو روپے انعام ''خان بہادر'' اور ''شمس العلماء'' کے خطاب ملے۔عربی، فارسی اور علم ریاضی کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، ادب، طبیعات، کیمیا اور سیاسیات میں بھی ماہر کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ کثیر التصانیف تھے۔ انھوں نے پہلی کتاب ہندوستانی کھیلوں سے متعلق تحریر کی۔ جبکہ دیگر تصانیف میں حساب، تاریخ ہند، یورپین تہذیب، طبعی علوم، تاریخ، جغرافیہ اور انگریزی سے اُردو میں تراجم کے علاوہ دیگر موضوعات پر مضامین اور مقالات اس زمانے کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے۔آپ کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں ہوا۔

نئی دہلی کی ایک تعمیر

(محمد ذکاءاللہ دہلوی)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو دہلی کی معاشرتی، ثقافتی زندگی کے بارے میں بتانا۔
- طلبہ کو مولوی ذکاءاللہ کے طرزِ تحریر سے واقفیت دلانا۔
- اُردو ادب میں مولوی ذکاءاللہ کے مقام سے آشنا کرنا۔

الفاظ و تراکیب

اہتمام	طاقچوں	حسانت	فیض رسانی	دایہ گری	گڈری
علت	نعمتِ عظمیٰ	قلعہ مُعلّیٰ	استوائی	خُلد مکانی	معابد

حضرت عُلیا ملکہ معظّمہ خُلد مکانی کی یادگار بنانے کے لیے دہلی والوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے چندے میں دیئے تھے اور یہ تجویز کی تھی کہ اس روپے سے زنانہ ہوسپٹل بنایا جائے۔ جس میں ہندوستانی عورتوں کو دایہ گری کا کام سکھایا جائے اور پردہ نشین عورتوں کا علاج اس طرح کیا جائے کہ وہ پردہ کے اندر اچھی طرح رہیں۔ اس کا نام وکٹوریا زنانہ ہوسپٹل رکھا جائے۔ اس چندے کی فراہمی کا اہتمام جناب فیض مآب جناب ڈگلس صاحب سی ای آئی ڈپٹی کمشنر سابق دہلی اور حال شملہ اور ان کی مسز کی سعی و جدوجہد سے ہوا تھا۔ صاحب بہادر نے اپنے عہد ڈپٹی کمشنری میں اس شہر کو بڑی رونق دی تھی۔ انھوں نے دہلی میں برقی روشنی کر کے بعض بازاروں میں رات کو دن بنا دیا اور جسمانی آنکھوں کی روشنی کو بڑھا دیا اور دہلی پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم بنا کے جہالت کی تاریکی کو دور کر کے دل کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔ غرض روحانی و جسمانی روشنی دہلی میں انھوں نے کر دی۔

اس شہر میں اس وسیع عمارت کے بنانے کے لیے کسی وسیع قطعہ زمین کا ملنا دشوار تھا۔ زمین ایسی گراں قیمت تھی، اگر وہ خریدی جاتی تو یہ سارا روپیہ اسی کے خریدنے میں لگ جاتا، کچھ نہ بچتا جو اور کام کیا جاتا۔ اس لیے جناب ڈپٹی کمشنر صاحب نے یہ تجویز کی کہ جامع مسجد کے پہلو میں جو دو قطعہ زمین افتادہ پڑا ہے، اس میں یہ ہسپتال تعمیر ہو۔ اس سے پہلے شاہجہانی دارالبقا جامع مسجد کے ساتھ ہی تھی۔ اس میں طلبہ کی درس و تدریس ہوتی تھی اور اس کے سامنے شاہجہانی دارالشفا بھی نافِ شہر میں تھی۔ غدر کے بعد یہ عمارتیں اس لیے مسمار کی گئی تھیں کہ جامع مسجد کے گرد وسیع میدان ہو۔ بڑی عمارتوں کی خوبصورتی جب تک نمایاں نہیں ہوتی کہ اس کے گرد میدان نہ ہو۔ اس قطعہ میں اس عمارت کی تعمیر شروع ہوئی اور تھوڑے دنوں میں پانچ سات ہزار روپے اس میں صرف ہوئے۔ پھر اس زمین کے موقع پر ایسے اعتراضات ہونے شروع ہوئے کہ وہ بجائے تعمیر ہونے کے مسمار ہونی شروع ہوئی اور جیسا میدان پہلے تھا، ویسا ہو گیا۔ اب اس میں گدڑی

لگتی ہے۔ شام کو اس میں رونق ہوتی ہے۔ اب پھر اس ہسپتال کے لیے نئی زمین کی تلاش ہوئی۔ شہر میں کہیں اس کے لیے کوئی زمین نہیں ملی تھی تو یہ تجویز ہوئی کہ یہ ہسپتال اس میدان میں ایک حصے میں بنایا جائے جو قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان مکانات مسمار کر کے بنایا گیا ہے اور اب وہ پریڈ کا میدان کہلاتا ہے۔ گورنر جنرل کی سفارش سے کمانڈر انچیف نے اس میدان میں سے اس حصے میں ہسپتال بنانے کی اجازت دی جو قلعہ کے محاذات سے بچا ہوا تھا۔ وہ ایسا تنگ تھا کہ ہسپتال کے لیے کافی نہ تھا۔ اس کے بڑھانے کے لیے ہمسایہ کے مکانات اور افتادہ زمینیں خریدی گئیں۔ اور سال گزشتہ میں جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی لیڈی صاحبہ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کی بنیاد کا پتھر رکھا۔ اب اس کے بننے کی تیاری ہو رہی ہے۔

یہ عمارت دو شاہجہانی عظیم الشان عمارتوں کے درمیان تعمیر ہوگی جن میں سے ایک جامع مسجد ہے جو اسلامی دنیا کی تمام مساجد میں اپنی حسانت میں سبقت لے گئی ہے۔ اس کے کل حصوں میں وہ تناسب ہے کہ دنیا میں کسی اور مسجد کے اندر نظر نہیں آیا۔ یہ عمارت ایک عبادت خانہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ اس میں پانچوں وقت کی نماز پڑھا کریں۔ قاعدہ یہ ہے کہ معابد کی عمارات کی خوشنمائی اس کے پجاریوں کو اپنی طرف خود بخود لے جاتی ہے اور مذہبوں میں عبادت کی طرف رغبت کرنے کے لیے عبادت خانوں میں آرکیٹیکچر (Architecture) و موسیقی و بت تراشی داخل کی گئی تھی مگر مسلمانوں نے سوائے عمارت کے خوبصورت بنانے کے اور چیزوں کو داخل نہیں کیا۔ ان کی جگہ اپنی ذہانت کو صرف عمارت کی حسانت میں خرچ کیا۔ مسجدیں بڑی خوبصورت بنائیں۔ چنانچہ اسی دلی کی جامع مسجد کی حسانت نے شہر میں ہزاروں آدمیوں کو نمازی بنا رکھا ہے کہ پانچ وقت میں ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں کرتے۔ جمعۃ الوداع کی نماز میں وہ دُور دُور سے اتنے مسلمانوں کو کثرت سے بلاتی ہے کہ اس کے اندر وہ نہیں سماتے۔ اس کے باہر تک نماز پڑھتے ہیں۔ اگر دلی میں یہ جامع مسجد نہ ہوتی تو اور شہروں کی نسبت اس شہر میں نمازی بھی زیادہ نہ ہوتے۔ اس کے نمونے کو دیکھ کر اور بڑی بڑی مسجدیں اکبر آبادی اور زینت المساجد اور فتح پوری کی مسجدیں بنائی گئی ہیں جس کے سبب سے مسلمانوں میں نماز کی پابندی زیادہ ہوگئی ہے۔ دوسری عمارت شاہجہانی قلعہ معلیٰ ہے۔ گو اس میں شاہجہان نے وہ حسانت اور استوائی نہیں رکھی تھی جو قلعہ میں ہونی چاہیے۔ اس لیے اس کو لال حویلی کہتے ہیں مگر اس کے اندر وہ نفیس و لطیف عمارات بنائی تھیں جن کا جواب اس وقت دنیا میں نہ تھا۔ دیوان خاص، دیوان عام، عقب حمام، مثمن برج اور بڑے بڑے محل ایسے ہیں کہ ان پر جو یہ شعر لکھا گیا ہے، اس کے وہ مصداق ہیں۔

؎ اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

غدر کے بعد یہ لال حویلی قلعہ ہوگیا ہے۔ اس کا حصار استوار کیا گیا ہے۔ اس کی زمینوں میں سے توپیں ایسی اپنی آنکھیں دکھا رہی ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کے روبرو کوئی دشمن کھڑا ہے جس کے اوپر وہ دھواں دھوں چھوٹنے والی ہیں۔ غرض جب ان دونوں عالیشان عمارتوں کے درمیان یہ ہسپتال بن جائے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ خوبصورت ماں باپوں کی گود میں ایک پیاری صورت کا خوش منظر بچہ بیٹھا ہے جو نہ اپنی ماں کی طرح مسلمانوں کی عبادت سے مخصوص ہے، نہ باپ کی طرح ہر روز جان ستانی کی ترکیبوں کے سکھانے کا معلوم ہے بلکہ وہ علی العلوم ان ماؤں کے حق میں مسیحائی کرتا ہے جو بچے کے دکھ درد میں مبتلا ہیں۔ وہ اپنی فیض رسانی سب ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ یکساں کرے گا۔ یہ فقط خجستہ آیات، مریم صفات ملکہ معظمہ کی پاک نفسی کی برکت ومیمنت ہے کہ اس شہر میں عورتوں کے دکھ درد کے لیے مسیحائی کی جائے گی۔ جب میں اس میدان میں اس فیض رساں عمارت بننے کا خیال کرتا ہوں اور غدر سے پہلے کی باتیں یاد کرتا ہوں کہ کیا اس میں ہوئی، پھر تو ایک عالم حیرت طاری ہوتا ہے۔

اس میدان میں خاص بازار تھا جو اس لیے بنا تھا کہ بادشاہ جب قلعہ سے مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اس بازار میں سے جاتے۔ اس میں بادشاہ کی سواری خستہ حال تو میں نے بارہا دیکھی ہے مگر تاریخ میں پڑھا ہے کہ اس میں ایسا ہجوم ہوتا تھا کہ آدمی کھچ مچ کے سبب سے پس جاتے تھے۔ یہ بازار بڑا چوڑا تھا۔ گو لمبا فیض بازار اور اردو بازار کے برابر نہ تھا۔ اس کے بیچ میں ایک بڑا مدور خوبصورت چوک تھا۔ پتھر کا فرش تھا۔ اب وہ سب مسمار ہوگیا، صرف دو نالیاں اس کی سڑک کی باقی ہیں جو اس کے حال پر نالاں نظر آتی ہیں۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں اس حکمت سے بنائی گئی ہیں کہ جتنا چلتے ہیں، اس کا قدم اونچا ہوتا ہے۔ اتنی وہ اونچی بھی ہیں تا کہ بچہ و بوڑھا بے تکان ایسی اونچی مسجد میں نماز پڑھنے چلا جائے۔ ان سیڑھیوں پر بڑے دروازے کے سامنے چبوترے پر سہ پہر کو کبوتر بکتے تھے۔ شہزادے دروازے کے طاقچوں میں تکلف کا بستر جما بچھا کے بیٹھتے تھے۔ ان کے پھندوں کے خمیروں کی خوشبو سے دماغ معطر ہوتے تھے۔ کبوتر باز پنجروں میں کبوتروں کے جوڑے ان کے سامنے لاتے تھے اور ان کو بیچ کر ایک ایک کو سو سو کرتے تھے۔ سیڑھیوں پر کتاب فروشوں کی دکانیں لگتی تھیں۔ ان میں قلمی کتابیں بہت بکتی تھیں۔ خوشنویس استادوں کے ہاتھ کے قطعات فروخت ہوتے تھے۔ ہتھیاروں کی بھی دکانیں لگتی تھیں جس میں ٹوٹے پھوٹے سپاہی ان جھوٹے ہتھیاروں کے جوہر دیکھتے تھے۔

سب سے نیچے کی سیڑھیوں پر مہا برہمنوں کی دکانیں مُردوں کے کپڑے بیچنے کی لگتی تھیں۔ غریب آدمیوں کو ان مُردوں کا مال سستا ہاتھ لگ جاتا تھا۔ پھر سیڑھیوں پر ہرے بھرے درگاہ کے درمیان ٹٹو، گھوڑے، بکری، بھیڑ، گائے، بیل بکتے تھے۔ چابک سوار اپنی شہسواری کا ہنر یہ دکھاتے تھے کہ ایک مرے ہوئے ٹٹو پر ایسی پٹری وہ جماتے تھے کہ ٹٹو کو اسپ

بادرفتار بنا کے گاہک کو دکھا دیتے تھے اور اس طرح خریدار کو ٹھگ لیتے تھے۔ ان سیڑھیوں کے گرد کے نیچے کے چبوتروں پر بزاز اپنے دکانوں کو بہارِ گلزار سے کم نہیں دکھاتے تھے۔ ان کی دکانوں پر ہر روز دو تین گھنٹے تک ہن برستا تھا۔ دوسرے دروازے کی سیڑھیوں پر مرغے، مرغیاں اور انڈے بکتے تھے۔ نوروز کے دنوں میں سبزوار کی مرغیوں کے انڈے لڑائے جاتے تھے اور لڑانے والے ان میں اپنا ہنر دکھاتے تھے۔ انڈوں کی قطاریں بھی لڑائی جاتی تھیں۔ بڑے دروازے کی سیڑھیوں پر ایک طرف شُہدے جو پہلے زمانے کے بگڑے ہوئے اشراف ہوتے تھے، کعبتیں کھیلتے تھے اور بڑے مزے کی گالیاں دیتے تھے کہ سننے والے ہنسی کے مارے پھڑک جاتے تھے۔ ان کو سرکار کی طرف سے جواء کھیلنے کی اجازت اس سبب سے تھی کہ کبھی کوئی ان میں سے چوری کی علت کرنے پر نہیں ہوا تھا۔ وہ ایسے دیانتدار تھے کہ مسلمان کی براتوں میں جہیز ان ہی کے سپرد کیا جاتا تھا کہ وہ دولہا کے گھر پہنچا دیں جس میں کبھی کوئی غبن نہیں ہوتا تھا۔ بس اب یہ سب باتیں خواب و خیال ہوگئیں مگر اب سب کے عوض میں اہل شہر کے لیے بڑی نعمت عظمیٰ یہ ہے کہ اس میدان میں یہ متبرک فیض رساں ہسپتال ہماری مادر مہربان کی یادگار بن جائے گا۔

(انتخاب مخزن از محمد اسلم)

مشق

۱) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) دہلی والوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ چندہ کس مقصد کے لیے دیا؟

ب) ڈپٹی کمشنر ڈگلس نے دہلی کے لیے کون سی خدمات انجام دیں؟

ج) شاہجہانی دار الشفا کہاں واقع تھا؟

د) جامع مسجد دہلی کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ہ) لال حویلی کو لال حویلی کیوں کہتے ہیں؟

و) معابد اور مسجد کی عمارت کی تعمیر میں کیا فرق ہے؟

۲) متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) مضمون ''نئی دہلی کی ایک تعمیر'' کے مصنف ہیں۔

(i) سرسید احمد خان (ii) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

(iii) مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی (iv) ڈاکٹر عبادت بریلوی

ب) جامع مسجد دہلی میں سب سے زیادہ نمازی جس موقع پر جمع ہوا کرتے تھے۔

(i) نماز فجر (ii) جمعۃ الوداع

(iii) نماز ظہر (iv) نماز مغرب

ج) اسپتال بنانے کی سفارش کی۔

(i) گورنر جنرل نے (ii) ڈپٹی کمشنر نے

(iii) کمانڈر انچیف نے (iv) سر ڈگلس نے

د) جس میں ہندوستانی عورتوں کو سکھایا جائے:

(i) دایہ گیری (ii) کڑھائی

(iii) سلائی (iv) ڈاکٹری

ہ) وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کی تعمیر کی اجازت ملی۔

(i) جامع مسجد کے پہلو میں (ii) دارالبقاء اور دارالشفاء کے درمیان

(iii) قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان (iv) لال حویلی کے سامنے

۳) متن کی روشنی میں درست کی نشاندہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) معابد کی عمارات کی خوشنمائی اس کے پجاریوں کے لیے کشش نہیں رکھتی ہے۔

ب) بڑی عمارتوں کی خوبصورتی اس وقت نمایاں نہیں ہوتی جب تک اس کے گرد میدان نہ ہو۔

ج) وکٹوریہ زنانہ ہوسپٹل کا سنگ بنیاد لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے رکھا۔

د) غدر کے بعد لال حویلی قلعہ میں تبدیل ہوئی۔

ہ) وکٹوریہ زنانہ ہوسپٹل کی تعمیر اس مقام پر ہوئی جہاں سب سے پہلے اس کی نشاندہی کی گئی تھی۔

۴) متن کی روشنی میں خالی جگہ پُر کریں۔

الف) اگر فردوس بر روئے .... ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔

ب) زنانہ وکٹوریہ ہوسپٹل کی تعمیر کا مقصد ہندوستانی عورتوں کو .... کا ہنر سکھانا تھا۔

ج) ہسپتال کے لیے ناکافی جگہ ہونے کی وجہ سے .... زمین خریدی گئی۔

د) لال قلعے کو پہلے .... کہتے تھے۔

ہ) دہلی میں بہت سے ترقیاتی کام کروانے والے ڈپٹی کمشنر کا نام .... تھا۔

۵) سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کریں۔

اس شہر میں اس وسیع عمارت بنانے .... وہ پریڈ کا میدان کہلاتا ہے۔

۶) ذیل الفاظ و تراکیب کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

قطعہ زمین۔ اُفتادہ۔ نافِ شہر۔ سبقت لے جانا۔ استوائی۔ عالم حیرت طاری ہونا۔ بادرفتار

۷) مصنف جب غدر سے پہلے کی باتیں یاد کرتا ہے تو اس پر عالم حیرت کیوں طاری ہوتا ہے؟

۸) محمد ذکاء اللہ کے طرز تحریر کی چیدہ چیدہ خصوصیات بتائیں۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام کمرہ جماعت میں طلبہ کو ایک طویل مضمون/کہانی سنائیں اور پھر مختلف طلباء سے اسے تسلسل کے ساتھ دُہرائیں۔
۲) اساتذہ کرام طلبہ سے مذکورہ مضمون کا مرکزی خیال/اہم نکات، کردار، واقعات کی تشریح استحسانی انداز میں لکھوائیں۔
۳) اساتذہ طلبہ کو اسلوب نثر سے متعلق معلومات دیں۔

اشاراتِ تدریس

۱) طلبہ کو اُردو میں مولوی ذکاء اللہ کے مقام پر ایک سیر حاصل لیکچر دیں۔
۲) طلبہ کو مولوی ذکاء اللہ کا طرزِ تحریر بتائیں۔
۳) طلبہ کو مضمون میں موجود مختلف تراکیب اور ان کے استعمال سے آگاہ کریں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

(حالاتِ زندگی)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ۱۹۰۶ء کو بنگلور ضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے فارسی، ایم۔اے عربی، ایم۔ایل۔او اور ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے منسلک رہنے کے بعد پھر تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں شعبہ اُردو قائم کیا گیا تو اِس کے بانی صدر مقرر ہوئے اور ترقی کرتے کرتے اورینٹل کالج کے پرنسپل بن گئے اور ریٹائرمنٹ تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ کچھ عرصہ ''اُردو دائرہ معارف اسلامیہ'' میں ادارتی فرائض بھی سرانجام دیے۔

آپ متعدد علمی و ادبی اداروں کے عہدہ دار رہے۔ جن میں ''انجمن ترقی اُردو پاکستان''، ''مرکزی اُردو بورڈ''، ''مجلس ترقی ادب''، ''ترقی اُردو بورڈ''، ''مجلس زبان دفتری''، ادارۂ تحقیقات اسلامی'' اور ''بزم اقبال'' شامل ہیں۔ آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں شہنشاہ ایران نے انھیں ''نشان سپاس'' اور حکومتِ پاکستان نے دو مرتبہ صدارتی ایوارڈ اور تمغوں سے نوازا۔

آپ کی زیرِنگرانی آٹھ جلدوں پر مشتمل ''معجم مصادر اسلامی'' طبع ہوئی۔ تعلیم اُردو فارسی، زبان و ادب، تاریخ، فلسفہ اور اسلامی تہذیب اُن کے خاص موضوعات ہیں۔ آپ کی چند نمایاں علمی و تحقیقی تصانیف یہ ہیں۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ اُردو ادب جنگ عظیم کے بعد، بحث و نظر، ولی سے اقبال تک، سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء، میر امن سے عبدالحق تک، اشارات تنقید اور اُردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۸ء کلچر کا مسئلہ، پاکستان میں اُردو کا مسئلہ، تعبیر و تعمیر، اُردو کی قدیم ترین لغت کی تنقیدی اشاعت (فارسی) سہیل اقبال۔ اُردو تذکرہ نگاری۔ آپ کا انتقال ۱۹۸۶ء میں لاہور میں ہوا۔

ادب کیا ہے؟

(ڈاکٹر سید محمد عبداللہ)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو ادب کی تعریف اور دائرہ کار سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو تنقید اور تخلیق کے تعلق کے بارے میں بتانا۔
- طلبہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ کی ادبی خدمات سے روشناس کروانا۔

الفاظ و تراکیب

ادراک	ترکیب و تحلیل	کارندہ	جامع و مانع	انبساط	تزکیہ نفوس
فنونِ لطیفہ	خودنوشت	ادبی انواع	شہر آشوب	ارجوزہ	قوتِ متخیلہ

انسان کی ذہنی کاوشوں کی تین بڑی انواع ہیں:

۱۔ سائنس ۲۔ فلسفہ ۳۔ آرٹ یا فن

سائنس کا مقصد ادراک حقیقت ہے مگر وہ طبیعیات، مادیات کی ترکیب و تحلیل پر غور کر کے مشاہدے، تجزیے اور تجربے کے ذریعے حقائق تک پہنچتی ہے۔ فلسفہ مابعدالطبیعیات (ذھنیات ومعقولات) پر غور کرتا ہے اور مختلف تصورات کو باہم ترتیب دے کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرٹ کا میدان ان سے وسیع تر ہے۔ یہ مادیات اور معقولات دونوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ زندگی کے ان سب خارجی اور داخلی حقائق پر حاوی ہے جو انسان کے تخیل میں آ سکتے ہیں۔ آرٹ کا کام ادراک حقیقت ہی نہیں بلکہ اس کا کام حقیقتوں کے توسط سے ایک نئی دنیا کی تخلیق بھی ہے اور اس معاملے میں تخیل اس کا کارندہ اور رہنما ہے۔ ادب بھی آرٹ یا فن کی ایک شاخ ہے۔

مگر ادب کی یہ تعریف کہ یہ ایک آرٹ ہے، بہت سادہ تعریف ہے۔ اصول ادب کی کتابوں میں اس کی کئی تعریفیں ملتی ہیں جن میں سے جامع اور مانع کوئی بھی نہیں۔ ہر تعریف ادب کے کسی نہ کسی نظریے کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے یا یوں کہیئے کہ ادب کے مختلف نظریے ان تعریفوں پر مبنی ہیں۔

میتھیو آرنلڈ کہتا ہے ”وہ تمام علم جو کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے، ادب ہے۔“

نیومین کہتا ہے ”انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعے“، یہ ادب ہے۔

برک کا خیال ہے کہ ادب تمام سرمایہ خیالات و احساسات ہے جو تحریر میں آ چکا ہے اور اس طرح مرتب ہوا ہے کہ اس کے پڑھنے سے قاری کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔

والٹر پیٹر کا قول ہے کہ ادب نفس، کاملہء انسانی کی ترجمانی یا انعکاس اس انداز سے کرے کہ اس کے کمالات

معنوی یا فضائلِ باطنی کا پورا پورا نقش کسی تحریر یا موضوعِ اظہار میں جلوہ گر یا منقش ہو جائے۔

یہ تعریفیں کم و بیش ادب کے اثر یا منفعت کے کسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کر رہی ہیں اور یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ ادب کا اثر یا تو انبساطِ خاطر ہے، یا باطنی انقلاب ہے یا اصلاحِ فکر و خیال ہے، یا تفریحِ نفس ہے، یا تزکیہ نفوس ہے۔

ان ناکافی تعریفوں کے پیشِ نظر شاید مناسب یہ ہوگا کہ ادب کی ایک ہی قوی اور جامع تعریف وضع کر لی جائے جو طویل بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر اس سے طالب العلم کو صحیح ماہیت معلوم ہو جائے۔ اس غرض سے ادب کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔

''ادب وہ فنِ لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے جذبہ و احساس کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و تنقید الفاظ کے واسطے سے کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوتِ مخترعہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے ایسے مؤثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن کے ذریعے سامع و قاری کا جذبہ و تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ۔''

اس طویل تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ ادب ایک فنِ لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے۔ اس کا مقصد اظہار، ترجمانی اور تنقید ہے، اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے، اس کے معاونِ اظہار تخیل اور قوتِ مخترعہ ہے اور اس کے خارجی روپ وہ حسین ہیئت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اس فنِ لطیف میں الفاظ مرکزی اہمیت رکھتے ہیں اور یہی چیز اس کو باقی فنونِ لطیفہ سے جدا کرتی ہے، ورنہ شدّتِ تاثر اور تخیل کی مُصوری اور تخلیق و اختراع کا عمل دوسرے فنون میں بھی ہے۔

ادب میں تحریر کی قید ایک اختلافی موضوع ہے مگر بالعموم ادب تحریری سرمائے کا نام ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ہر لکھی ہوئی شے ادب نہیں۔ ادب تو صرف وہی تحریر ہوگی جس میں زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی سچی ترجمانی حسین انداز میں کی گئی ہوگی اور حُسن سے مراد وہ ہیئت ہے جو مجموعی اعتبار سے متعلقہ احساسات و تجربات کے لیے موزوں ہوگی اور جس کی تعمیر میں خوبصورت اجزاء، موزوں الفاظ اور موزوں تراکیب سے کام لیا گیا ہوگا، تاکہ اس کو سننے اور پڑھنے والا ایک عام صحت مند انسان اس سے انبساط، مسرت، غم و درد وغیرہ کی کیفیت محسوس کرے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ادب یا تخلیقی ادب کی کئی شاخیں ہیں۔ ان میں جذبے کا فرق نہیں بلکہ جذبے کے اظہار کے طریقوں اور

صورتوں کا فرق ہے۔ادب کی اہم صورتیں یا شاخیں کم وبیش یہ ہیں:

(۱) شاعری، (۲) ناول، (۳) افسانوی انواع، (۴) ڈراما، (۵) ذاتی روزنامچے، (۶) مضمون لطیف (Essay)، (۷) ذاتی خطوط۔ تاثراتی، (۸) سفرنامے۔ تاثراتی مثلاً عبدالقادر کا سفرنامہ مقام خلافت، (۹) خودنوشت سوانح عمریاں، (۱۰) دیگر وہ تحریریں جو تخلیقی یا تاثراتی عنصر کے غلبے کے باعث ادب کے درجے تک پہنچ چکی ہوں۔ مثلاً تاریخ میں ''الفاروق' اور 'دربار اکبری'، تنقید میں 'مقدمہ شعر و شاعری'، 'آبِ حیات' اور 'شعرالعجم' یا علمی تحریروں میں مولانا ظفر علی خان کی ترجمہ شدہ، کتاب 'معرکہ، مذہب و سائنس'۔

ارتقائے ادب کی تاریخ میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ مختلف ادبی انواع کس طرح وجود میں آئیں؟ اس کی صورتیں ہر ملک اور تہذیب کے سلسلے میں مختلف ہیں۔ عرب میں شاعری اور اس کی مختلف شاخوں (مثلاً قصیدہ اور ارجوزہ) کا ارتقاء اہل عرب کے خالص سماجی اور مقامی ماحول کے اثرات کے ماتحت ہوا۔ غزل، مثنوی، رباعی اور اسی طرح فارسی کا افسانوی اور داستانی ادب اور عربی نثر میں مقامات اور صفات...... یہ سب اہل ایران کے مخصوص سماجی اور مجلسی عوامل کے زیر اثر وجود میں آ کر ترقی پذیر ہوئے۔ اُردو میں مرثیہ، ریختی اور ایک لحاظ سے شہر آشوب نے خاص تاریخی حالات کے تحت ترقی کی۔

ارسطو اور اس کے بعض مقلدین نے ادبی اصناف کی بنیاد دو چیزوں پر رکھی ہے: اوّل طریق اظہار پر، دوم مخاطبوں کی نوعیت پر یا اس مواد پر جو کسی ادبی صنف میں پیش کیا جارہا ہے۔ مثلاً شاعری کی اصناف میں المیہ (ٹریجڈی) دیوتاؤں اور قومی سورماؤں کا ڈراما ہے۔ طربیہ (کومیڈی) میں عام لوگوں کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ فرانسس بیکن اور ہابس نے غنائی شاعری کو بالکل نظرانداز کردیا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں یہ زندگی سے تعلق نہیں رکھتی۔ بیکن نے تمثیلی شاعری کو انواع میں شمار کیا ہے اور ہابس ڈراما اور بیانیہ کو تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے: (۱) درباری (ٹریجڈی اور رزمیہ)، (۲) شہری (کومیڈی اور ہجویہ) اور (۳) دیہات سے متعلق Pastoral اور دیہی کومیڈی)۔

گزشتہ سطور میں ادب کی جن مختلف شاخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی مفصل جزئیات کسی اور موقع پر پیش ہوں گی۔ یہاں ان کی موٹی موٹی اقسام بیان ہوئی ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ادبی انواع یا اصناف کے علیحدہ وجود کا تعین کن وجوہ سے ہوا۔

(مباحث از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) ادب کی تعریف کیجیے۔

ب) برک کے خیال میں ادب کیا ہے؟

ج) عربی شاعری کا ارتقائی عمل کس طرح وقوع پذیر ہوا؟

د) کون سی اصنافِ ادب ایران کی سرزمین کی پیداوار ہیں؟

ہ) ادب اور سائنس میں کیا فرق ہے؟

و) آرٹ کا میدان کس طرح سائنس سے وسیع تر ہے؟

۲۔ متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) سائنس کا مقصد ہے:

(i) نئی نئی ایجادات (ii) ادراکِ حقیقت

(iii) تحلیل فلسفہ (iv) اظہارِ تخیل

ب) وہ تمام علوم جو کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں ادب ہے:

(i) والٹر پیٹر (ii) برک

(iii) میتھیو آرنلڈ (iv) نیومین

ج) ادب کا موضوع ہے:

(i) زندگی (ii) فن

(iii) اصلاح (iv) فلسفہ

د) ادب میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں:

(i) نظریات (ii) اصناف

(iii) تنقید وتخلیق (iv) الفاظ

ہ) ارسطو اور اُس کے مقلدین نے ادب کی بنیاد چیزوں پر رکھی ہے:

(i) دو (ii) تین

(iii) چار (iv) پانچ

۳۔ متن کے مطابق درست کی نشان دہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) ادب آرٹ یا فن کی ایک شاخ ہے۔

ب) خودنوشت سوانح عمریاں ادب کے دائرہ کار سے خارج ہیں۔

ج) ادب میں تحریر کی قید ایک اختلافی موضوع ہے۔

د) غزل اور مثنوی اہل عرب کی پیداوار ہیں۔

ہ) کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' ایک تنقیدی کتاب ہے۔

۴۔ متن کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

الف) آرٹ کا کام .... ہی نہیں بلکہ اس کا کام حقیقتوں کے توسط سے ایک نئی .... کی تخلیق بھی ہے۔

ب) ادب ایک فن .... ہے۔

ج) کتاب ''معرکہ مذہب و سائنس'' کا مصنف .... ہے۔

د) ارتقائی ادب کی صورتیں ہر ملک اور تہذیب کے سلسلے میں .... ہیں۔

ہ) ہابس کے مطابق ڈرامہ کی اقسام کی تعداد .... ہے۔

۵۔ متن کے مطابق کالم (الف) کا تعلق کالم (ب) سے جوڑیں اور جواب کالم (ج) میں لکھیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
افسانہ اور داستان	اہل عرب	....
مرثیہ اور شہر آشوب	اہلِ ایران	....
قصیدہ اور ارجوزہ	ادب	....
فنِ لطیف	سائنس	....
ادراکِ حقیقت	اُردو	....
		....

۶۔ سیاق و سباق کے حوالے سے متن کی تشریح کریں۔

ارسطو اور اُس کے بعض مقلدین نے .... دیہات سے متعلق (Pastocal اور دیہی کومیڈی)۔

۷۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیں۔

۸۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کمرا جماعت میں کسی علمی و ادبی موضوع پر عمدہ لب و لہجہ کے ساتھ پانچ منٹ تک زبانی تقاریر کروائیں۔

۲۔ طلبہ کو کتابی مباحث سے چند اور تنقیدی مضامین سنا کر اُن سے مختلف نکات کی وضاحت کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو ادب کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کے بارے میں بتائیں۔

۲۔ طلبہ کو تخلیق کی درست ماہیت اور مقصد سے آگاہ کریں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

(حالاتِ زندگی)

اُردو کے اس عظیم مؤرخ، محقق اور نقاد کا اصل نام عبادت یار خان جب کہ قلمی نام عبادت بریلوی تھا۔ ۱۹۲۰ء میں بریلی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بریلی ہی میں حاصل کی اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز، ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کا موضوع ''اُردو تنقید کا ارتقاء'' تھا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک لکھنؤ یونیورسٹی اور ۱۹۴۴ء سے قیام پاکستان تک اینگلو عربک کالج دہلی میں لیکچرار رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جرمن زبان کا کورس مکمل کرلیا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آئے۔ جہاں پنجاب یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد تعینات ہوئے۔ پہلے صدر شعبہ اُردو اور پھر اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۸۰ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اُردو زبان و ادب کے عظیم مؤرخ ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد تاریخی کتب اِس کا واضح ثبوت ہیں۔ تحقیق کے میدان میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ مگر اُن کا اصل میدان تنقید ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک درجن سے زائد کتب تحریر کی ہیں۔ انھوں نے مختلف نثر نگاروں اور شعراء کے کام کا تجزیہ اور جائزہ لیا۔ ان پر سیر حاصل بحث کی۔ آپ چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں اُردو تنقید کا ارتقاء، غزل اور مطالعہء غزل، مومن اور مطالعہء مومن، جدید شاعری، غالب اور مطالعہء غالب، غالب کا فن شاعری، شاعری کی تنقید، تنقیدی تجزیے، تنقیدی جائزے، روایت کی اہمیت، اقبال کی نثر، ادب اور ادبی قدریں، کلیات میر، خطباتِ عبدالحق، مقدمات عبدالحق، ارضِ پاک سے فرنگ تک، خواجہ میر درد، ولی دکنی، جدید اُردو ادب، جدید اُردو تنقید، جشن نامہ اقبال قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۹۸ء میں لاہور میں ہوا۔

تنقید میں توازن

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو تنقید کی تعریف بتانا۔
- ادب میں تنقید کی اہمیت سے آگاہی دینا۔
- اردو ادب میں تنقید کی روایت سے روشناس کروانا۔
- اُردو تنقیدی ادب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مقام بتانا۔

الفاظ و تراکیب

تخلیق، جبلت، امتزاج، منطقی حدود، استحرار، جمالیاتی، نقاد، متلاشی، فیاضی، اضطراری، نظریۂ حیات، عمل ارتقاء، تخلیقِ حُسن، تجسم، برانگیختہ

ارسطو نے فن شعر کی تخلیق کو نقالی کا نتیجہ بتایا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس سلسلے میں توازن اور تناسب کی اہمیت بھی ذہن نشین کرائی ہے۔ نقل کی جبلت بغیر احساسِ توازن کے فن کی صورت اختیار نہیں کرسکتی، توازن سے اس میں حُسن پیدا ہوتا ہے اور حُسن درحقیقت توازن ہی کا نام ہے۔ فن میں یہ توازن نہ ہو تو دلکشی پیدا نہیں ہوتی اور دلکشی باقی نہ رہے تو فن، فن نہیں رہتا۔ اس لیے فن اور توازن لازم و ملزوم ہیں۔

شعروادب کی طرح، تنقید بھی ایک فن ہے، اور فن کی حیثیت سے نہ صرف حُسن کی حامل ہے بلکہ تخلیقِ حسن کی معاون بھی ہے۔ چنانچہ تخلیقِ فن کے لیے جس توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس کی اہمیت کا صحیح احساس اور اندازہ تنقید ہی میں ہوتا ہے۔ توازن کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر توازن ناممکن سی بات ہے۔ توازن سے تنقید میں معنویت بھی پیدا ہوتی ہے اور حُسن بھی اور تنقید میں معنویت اور حُسن کے امتزاج اور ہم آہنگی ہی کا نام توازن ہے۔

توازن خارجی طور پر وجود نہیں رکھتا۔ وہ تو ایک کیفیت ہوتی ہے جس کو مجسم کردیا جاتا ہے۔ یہ تجسم صحیح احساس، صحیح ادراک اور صحیح شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے، سوچتا ہے، سمجھتا ہے اور اِن سب کے نتیجے میں توازن کی تخلیق ہوتی ہے۔ اگر انسان محسوس نہ کرے اور غور نہ کرے تو توازن پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر سوچے سمجھے گا نہیں تو توازن پیدا نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے یہ دیکھا گیا ہے کہ توازن کی کمی انھیں لوگوں کے یہاں شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔ جو ان صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں یا جن میں یہ صلاحیتیں کم ہوتی ہیں۔ یا پھر ان لوگوں کے یہاں توازن کی اس کمی کا احساس ہوتا ہے جن میں محسوس کرنے، غور کرنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تو ہوتی ہیں لیکن جو ان سے خاطر خواہ کام نہیں لیتے، یا کسی وجہ سے کام نہیں لے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے ہر شعبے میں اس توازن کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے کیونکہ اگر یہ توازن موجود نہ ہو تو ارتقاء کی راہ پر گامزن رہنا اس کے لیے ناممکن ہوجائے۔ تو گویا توازن ہی زندگی

کے اس ارتقائی عمل میں نیا خون دوڑاتا ہے اور اس طرح اس میں نئی زندگی کی لہریں اُٹھتی رہتی ہیں۔

فن اسی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ اس عکاسی اور ترجمانی میں فیاضی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اور اس طرح اس کی حدیں تنقیدِ حیات سے جا ملتی ہیں اس لیے فن کے بارے میں صرف یہ رائے قائم کرلینا کہ وہ محض جذبات کی برانگیختگی کا نام ہے اور اس کی تخلیق کی نوعیت اضطراری ہے، اپنے اندر ایک سطحیت رکھتا ہے۔ فن کا تعلق جذبات کے برانگیختہ ہونے سے بڑا گہرا ہے۔ لیکن اس کی حدود یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ کیونکہ عقل وشعور بھی اس کی تخلیق میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ جذبات کے ساتھ اس میں غور وفکر کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ عنصر اس میں موجود نہ ہو تو اس میں گہرائی پیدا نہیں ہوسکتی۔ فن میں جذبات کی برانگیختگی کے ساتھ عقل وشعور اور غور وفکر کی فراوانی توازن کو پیدا کرتی ہے۔ اور یہ توازن ہی فن کو ان خصوصیات سے ہم آہنگ کرکے حقیقت و واقعیت کی منزلوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ حقیقت و واقعیت فن کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ اور چونکہ توازن اس کو پیدا کرنے میں ممد ومعاون ہوتا ہے اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تنقید اس فن سے بڑا گہرا ربط رکھتی ہے۔ فن کو اس حقیقت وواقعیت سے ہمکنار کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لیے فن کے ساتھ ساتھ توازن کی اہمیت اس میں بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر اس توازن کا وجود نہ ہو تو فن اپنے آپ کو عقل وشعور اور غور وفکر سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں کرسکتا۔ اور جب یہ خصوصیت اس میں موجود نہ ہو تو حقیقت و واقعیت سے اس کا محروم ہوجانا یقینی ہے۔ اس لیے فن خود بھی تنقید میں توازن کا متلاشی رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے سہارے خود اس میں توازن کی خصوصیت رونما ہوتی ہے۔ اور تنقید فن کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کسی حال میں بھی، توازن کے دامن کو چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتی۔ جہاں اور جب کبھی بھی توازن کا یہ دامن تنقید کے ہاتھ چھوٹ جاتا ہے، وہاں وہ تنقید باقی نہیں رہتی۔ فن اس کو منہ نہیں لگاتا اور اس سے روگردانی اختیار کرلیتا ہے۔ کیونکہ اس عالم میں فن کے تقاضے اس کے ہاتھوں پورے نہیں ہوتے۔ اس عالم میں وہ یوسف بے کارواں ہوکر اکیلی بھٹکتی پھرتی ہے۔ کوئی بھی اس کا پوچھنے والا نہیں ہوتا۔

یہ بات اب صاف ہوگئی کہ تنقید اور توازن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس منزل تک پہنچنے میں تنقید کو کون کون سی راہیں طے کرنی ہوتی ہیں۔ اور ان راہوں کو طے کرنے میں اُسے کن کن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟۔ ان سوالوں کا خاطر خواہ جواب اس وقت تک ممکن نہیں جب تک، تنقید کے صحیح مفہوم، اس کے صحیح منصب اور اس کے صحیح مقصد کا اندازہ نہ لگالیا جائے۔

تنقید کی تعریف میں اختلافات ہوسکتے ہیں لیکن اس حقیقت سے تو شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اس کا آغاز بنیادی طور پر تاثر سے ہوتا ہے۔ یہ تاثر ہی تنقید کی پہلی منزل ہے۔ لیکن صرف اس تاثر کو تنقید نہیں کہا جاسکتا۔ اس تاثر کو تنقید تک پہنچنے میں بہت سی منزلیں طے کرنی ہوتی ہیں۔ تاثر تو ویسے ہر فرد پر ہوسکتا ہے لیکن نقاد کے تاثر کی نوعیت مختلف ہوجاتی ہے کیونکہ اس کا شعور عام افراد سے زیادہ بیدار ہوتا ہے اور اس کی ذہنی سطح ان افراد کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ بلند ہوتی ہے۔ اس لیے یہ تاثر اس کے یہاں ایک نئی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ نقاد کے لیے یہ لازمی اور ضروری نہیں کہ وہ ہر ادبی تخلیق کا تاثر صرف اس طرح قبول کرے کہ اس کے سامنے پر مجبور ہوجائے یا پھر اس پر نکتہ چینی شروع کردے۔ نقاد اس تاثر کو اپنے شعور کی روشنی میں دیکھتا ہے اور اس طرح کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس تجزیے کے ساتھ تنقید کی ابتدا ہوتی ہے۔

تاثر کے اس تجزیے میں جب تک توازن نہ ہو اُس وقت تک اس تجزیے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، یعنی تنقید پیدا نہیں ہوتی۔ جب اس تجزیے کی بنیاد توازن پر ہوتی ہے اسی وقت تنقید کا وجود ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح طور پر تنقید توازن ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ توازن نہ ہو تو تخلیق کے تاثر کو بھی تنقید سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور تشریح و تفسیر بھی تنقید کہلائی جاسکتی ہے۔ توازن تنقید کو ان گھروندوں سے باہر نکالتا ہے۔ اور اس کی صحیح حیثیت کو متعین کرتا ہے، توازن نہ ہو تو تنقید کے ساتھ تجزیے کا خیال نہیں آسکتا، اور اس کے ساتھ تنقید کا رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔ فرد کے متوازن ہونے کے نتیجے میں یہ صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اسی لیے تنقید اگر متوازن نہ ہو تو تنقید محض تاثراتی ہوکر رہ جاتی ہے اور جذباتی و جمالیاتی حدود سے باہر نہیں نکلتی۔ اور اگر وہ ان حدوں کو توڑ کر باہر نکل گئی تو یا تو وہ تمام تر سماجی ہوجاتی ہے یا عمرانی۔ مطلب یہ ہے کہ توازن کے بغیر انتہا پسندی سے اس کا دامن بچانا مشکل ہوجاتا ہے اور جب تنقید میں یہ انتہا پسندی پیدا ہوجائے تو پھر وہ تنقید نہیں رہ جاتی۔ ایک نعرے کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ ایک ایسا نعرہ جو ادبی اور فنی اقدار کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تنقید بغیر کسی نقطۂ نظر کے بھی متوازن ہوسکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ تنقید ایک نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات ہی کا نام ہے۔ جو بات بھی کسی فنی تخلیق کے بارے میں کہی جاتی ہے جس خیال کا اظہار بھی کیا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات کی بُنیادیں عقل و شعور پر اُستوار ہوتی ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات بعض اوقات برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہوتی ہے۔ لیکن نظریات مختلف ہوسکتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں مختلف زاویوں سے سوچا جاسکتا ہے۔ اس لیے ان میں اختلافات کا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں ہوتا۔ اس اختلاف سے کبھی کبھی جذباتیت اور انتہا پسندی کو شہ ملتی ہے۔

چنانچہ تنقید میں بھی اس کا اظہار ہو جاتا ہے۔ لیکن توازن تنقید کو جذباتیت اور انتہا پسندی کی سرحدوں میں داخل ہونے سے روکے رکھتا ہے۔ اس کے سہارے نقطہ نظر اور نظریہء حیات کی وضاحت تو ہوتی ہے لیکن یہ وضاحت منطقی حدود سے باہر نہیں نکلتی۔

اس طرح توازن تنقید میں نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات کو اس کی اصل حیثیت کا احساس دلاتا ہے، اس سے صحیح کام لیتا ہے اور اس طرح تنقید میں اس کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

(تنقیدی تجزیے)

مشق

۱) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) تنقید کی تعریف کریں۔

ب) تنقید کی ابتداء کس طرح ہوئی؟

ج) فن اور توازن کس طرح لازم و ملزوم ہیں؟

د) زندگی کے ہر شعبے میں توازن کی اہمیت کیوں محسوس کی جاتی ہے؟

ہ) نقاد کے تاثر کی نوعیت ایک عام فرد کے تاثر کی نوعیت سے کس طرح مختلف ہوتی ہے؟

۲) متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) توازن سے شعر کی تخلیق میں پیدا ہوتا ہے۔

(i) شعور (ii) لُطف

(iii) حُسن (iv) فن

ب) توازن نام ہے ایک۔

(i) رویے کا (ii) ذہنیت کا

(iii) کیفیت کا (iv) حُسن کا

ج) تنقید کا آغاز بنیادی طور پر ہوتا ہے۔

(i) تخلیق سے (ii) تحقیق سے

(iii) تاثر سے (iv) مطالعہ سے

د) توازن کی بنیادیں اُستوار ہوتی ہیں۔

(i) تاثر میں (ii) تنقید میں

(iii) بحث و مباحثے میں (iv) سوچ و بچار میں

ہ) توازن کے ذریعے وضاحت ہوتی ہے۔

(i) نقطہ نظر کی (ii) تخلیق کی

(iii) تحقیق کی (iv) اندازِ بیاں کی

۳) متن کے مطابق درست کی نشان دہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) توازن خارجی طور پر وجود رکھتا ہے۔

ب) عقل و شعور فن کی تخلیق میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

ج) شعر و ادب کی طرح تنقید بھی ایک فن ہے۔

د) تنقید اور توازن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ہ) تاثر، تنقید کی آخری منزل ہے۔

۴) متن کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

الف) تنقید کی .... میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔

ب) تنقید ایک نقطہ نظر اور .... کا نام ہے۔

ج) تخلیق میں جذبات کے ساتھ .... کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

د) زندگی کے بارے میں .... ہونا ایک معیوب عمل ہے۔

ہ) توازن کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر توازن .... سی بات ہے۔

۵) سیاق و سباق کے حوالے سے متن کی تشریح کریں۔

فن اسی زندگی کی عکاسی .... غور و فکر کا عنصر بھی ہوتا ہے۔

۶) درج ذیل تراکیب و محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

تخلیقِ حُسن ۔ نظریۂ حیات ۔ نکتہ نظر ۔ چولی دامن کا ساتھ ہونا ۔ عملِ ارتقاء ۔ دامن بچانا ۔ یوسفِ بے کارواں

تنقید

تنقید چند ایسے اصولوں کا نام ہے جن کے باعث کسی بھی ادب کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اس سے ادب کی تمام خوبیاں اور خامیاں عیاں ہو جاتی ہیں اور قاری ان کا بہ طریق احسن جائزہ لے سکتا ہے۔ تنقید کا مقصد کسی بھی ادب کے دونوں پہلوؤں کا پوری طرح جائزہ لینا ہے۔ تنقید نہ ہو تو ادب میں غیر معیاری باتیں شامل ہو کر ادب کا مقام پیوندِ خاک کر سکتی ہیں۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو کمرا جماعت میں احساس، جذبے اور تاثر سے بھرپور مضامین سنائیں جن کی زبان مجازی ہو مگر طلبہ سے حقیقت کا ادراک کروائیں۔
۲) طلبہ کو استحسانی اور تنقیدی گفتگو سنا کر انھیں اس کی مختلف جہتیں سمجھائیں۔
۳) طلبہ سے لائبریری میں تنقید کی کوئی کتاب تلاش کروا کر اُس سے چند مضامین کمرا جماعت میں سنوائے جائیں۔
۴) ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کوئی اور تنقیدی مضمون سنوائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو تنقید کی تعریف بتائیں۔
۲) طلبہ کو اُردو ادب میں تنقید کی روایت اور اہمیت کے بارے میں بتائیں۔
۳) طلبہ کو اُردو کے تنقیدی ادب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مقام سے آگاہ کریں۔
۴) طلبہ کو ادب کی ترقی میں تنقید کے کردار سے آگاہ کریں۔

آبادی اور منصوبہ بندی

(مؤلفین)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو آبادی میں اضافے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو آبادی میں توازن رکھنے کی اہمیت بتانا۔
- پاکستان میں بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل سے واقفیت دلانا۔

الفاظ و تراکیب

ثقافتی	سول سوسائٹی	ہم آہنگ	ماہر معاشیات	شرح افزائش
آگاہی	میڈیا	سبز انقلاب	شرح اموات	شعور

اس وقت دنیا کو جن چیلنجوں اور مسائل کا سامنا ہے ان میں ایک اہم مسئلہ آبادی کا بے تحاشا پھیلاؤ ہے۔ ماہرین عمرانیات و معاشیات سر جوڑ کر نئے نئے منصوبے سوچ رہے ہیں تاکہ بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پایا جا سکے۔ آبادی میں اضافے کی رفتار اٹھارویں صدی عیسوی میں اس وقت تیز ہوئی۔ جب زرعی پیداوار نے ڈرامائی طور پر انسانی آبادی میں اضافے میں مدد کی۔ صنعتی انقلاب نے عالمی سطح پر تجارت کو فروغ دیا اور انسانی صحت کے وسائل میں بہتری نے شرح اموات کو کم کیا اور یہ وجوہات انسانی آبادی میں اضافے کا موجب بنیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں زرعی پیداوار کے اضافے نے سبز انقلاب برپا کیا۔ جس نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان انسانی آبادی کو کم و بیش دوگنا کر دیا۔

دنیا کی آبادی میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا براہِ راست اثر معیشت اور ماحول پر پڑ رہا ہے اور دنیا میں آبادی اور وسائل کی دستیابی میں عدم توازن کی کیفیت کی وجہ سے پوری دنیا بالعموم اور تیسری دنیا بالخصوص متاثر ہو رہی ہے۔ اس امر میں کوئی بات پوشیدہ نہیں کہ آبادی کو کنٹرول کیے بغیر کوئی ملک یا تہذیب ترقی کر سکے۔ مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے جبکہ ترقی کی دوڑ میں ۱۴۵ ویں نمبر پر ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارہ یو۔این۔ڈی۔پی کی ہیومن ڈویلپمنٹ سالانہ رپورٹ کے مطابق پاکستان شرح آمدنی کے لحاظ سے ۱۷۷ ممالک میں سے ۱۳۶ ویں نمبر پر ہے۔ جہاں کل آبادی کا ۷۳٫۶ فی صد حصہ کی یومیہ فی کس آمدنی دو ڈالر سے کم ہے جو ایک لمحہ فکریہ ہے۔ جس کی وجہ سے بے شمار معاشرتی خرابیاں جنم لے رہی ہیں۔ انتہا پسندی، دہشت گردی جرائم کی شرح میں اضافہ، بے روزگاری اور غربت جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

پاکستان میں ۴۵ فیصد آبادی کو صحت کی سہولتیں میسر نہیں۔ ۳۱ فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا۔ ایک

کمرے میں اوسطاً چھ افراد رہائش پذیر ہیں جبکہ ۵۰ فیصد آبادی ایک مکان میں رہتی ہے۔ ۶۴ فیصد افراد ناخواندہ ہیں۔ ملک کی ۳۰ فیصد آبادی غربت کی سطح سے بھی کم درجے کی زندگی بسر کررہی ہے۔ اس زبوں حالی کا واحد حل آبادی میں تیزی سے ہونے والے اضافہ کی شرح کو کم کرنا ہے۔

پاکستان کی آبادی جو ۱۹۵۱ء میں تین کروڑ چالیس لاکھ تھی۔ ۲۰۰۱ء کے وسط تک بڑھ کر چودہ کروڑ پچیس لاکھ ہوگئی، نتیجتاً صرف پانچ دہائیوں میں افراد کی تعداد میں اٹھارہ لاکھ سے زیادہ اضافہ پچھلے تیس سالوں میں شرح افزائش میں زیادتی کی وجہ سے ہوا۔ پیدائش میں زیادہ اضافہ جاری رہنے کی صورت میں ۲۰۲۰ء میں پاکستان کی آبادی بائیس کروڑ ہو جائے گی۔ انسانی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹیں مثلاً کم خواندگی، بچوں کی زیادہ اموات، معاشی ترقی کی شرح میں کمی کے ساتھ اتنی زیادہ آبادی، غربت کم کرنے اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں کو بری طرح متاثر کرے گی۔

اگرچہ آبادی کی شرح میں اضافہ پچھلی دہائیوں کی شرح ۳ فیصد سے کم ہوکر ۲.۱ فیصد سالانہ کی سطح پر آچکا ہے تاہم دوسرے ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ میں یہ شرح اضافہ اب بھی خطرناک حد تک زیادہ ہے۔

آبادی میں اضافے کا دارومدار تین باتوں پر ہوتا ہے۔

۱۔ شرح پیدائش ۲۔ شرح اموات ۳۔ نقل مکانی

ہمارے ملک میں پہلا عنصر یعنی شرح پیدائش آبادی میں اضافے کی اہم وجہ ہے۔ اس کے علاوہ کم عمری کی شادیاں، زیادہ اولاد کی خواہش، تعلیم وشعور کی کمی وغیرہ بھی آبادی میں اضافے کا باعث ہے۔ اس ضمن میں دوسرے عنصر شرح اموات کو بھی بڑا دخل حاصل ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں صحت کی سہولیات میں ماضی کے مقابلے میں کافی بہتری آئی ہے جس کی بنیاد پر شرح اموات میں بھی کافی کمی واقع ہوئی ہے جبکہ تیسرا عنصر جو ہمارے ملک میں آبادی کے اضافے کا بڑا موجب ہے وہ ہمسایہ ممالک سے مختلف وجوہات کی بناء پر نقل مکانی کر کے کئی دہائیوں سے یہاں آباد ہونا ہے۔

آبادی اور ترقی کے باہمی تعلقات کو ۱۹۹۴ء میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس برائے آبادی وترقی (آئی سی پی ڈی) کے آئندہ کے پروگرام میں واضح کیا گیا ہے کہ ہر ملک اپنے وسائل اور آبادی میں اپنی پالیسیوں کے تحت توازن پیدا کرے جو اس کے سماجی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو۔ پاکستان نے بھی اس ایکشن پلان پر دستخط کیے ہیں۔

ہمارے ملک میں آبادی پر قابو پانے کے لیے میڈیا، سول سوسائٹی اور اساتذہ کرام اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آبادی پر قابو پانا ایک معاشرتی تعلیم ہے جو معاشرتی تغافل میں مبتلا عوام میں پھیلائی جا سکتی ہے۔ ایک استاد لوگوں کو

معاشرے میں آبادی کے اضافے کے نقصانات سے بخوبی آگاہ کرسکتا ہے۔ وہ عوام میں یہ شعور اور آگہی پیدا کرسکتا ہے کہ آبادی میں اضافے کی صورت میں اُن کی تعلیم، خوراک اور علاج پر زیادہ اور بہتر توجہ نہیں دی جاسکتی جبکہ کم آبادی کی صورت میں وسائل بہتر طور پر اُن کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے زیادہ اچھے نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مزید برآں استاد ان ثقافتی رکاوٹوں کو لوگوں کے ذہن سے دُور کرسکتا ہے جو اس منصوبے کی راہ میں حائل ہیں۔

قدیم دور میں قبائلی اور گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے خاندان کے تحفظ کے لیے زیادہ اولاد درکار ہوتی تھی جو دشمنوں کے خلاف خاندان کا دفاع کرسکیں۔ مگر جدید ترقی یافتہ دور میں اب خاندان کے تحفظ کے لیے زیادہ انسانوں کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ ایک تعلیم یافتہ اور مفید شخص خاندان کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ خاندان کا سہارا بن سکتا ہے اور تمام خاندان کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتا ہے جبکہ دوسری طرف خاندان میں بہت سے بے روزگار یا بیمار افراد خاندان اور معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ اساتذہ کرام عوام میں یہ شعور اور آگاہی پیدا کرسکتے ہیں۔ کہ زیادہ بچے پیدا کرنے کی صورت میں ان کی تعلیم، خوراک اور علاج پر زیادہ اور بہتر توجہ نہیں دی جاسکتی۔ جبکہ کم بچے پیدا کرنے کی صورت میں وسائل بہتر طور پر ان پر خرچ کر کے زیادہ اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

دنیا کے اکثر اسلامی ممالک نے بڑھتی ہوئی آبادی۔ سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور اس پر خاصی حد تک قابو پالیا ہے۔ ان ممالک میں بنگلہ دیش، انڈونیشیا، مصر، ترکی اور ایران وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں تعلیم کو عام کیا گیا۔ بالخصوص خواتین کو پڑھایا گیا۔ یہاں کے علماء اور آئمہ کرام نے بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل میں بڑھ چڑھ کر حکومت کا ہاتھ بٹایا ہے۔

عالمی سطح پر دنیا میں آبادی پر قابو پانے کے لیے ہر سال ۱۱ر جولائی کو ’’ورلڈ پاپولیشن ڈے‘‘ منایا جاتا ہے۔ اس دن کو منانے کا مقصد لوگوں میں اس مسئلے کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہے اور یہ دن پاکستان میں بھی منایا جاتا ہے مگر اس کے تا حال خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اِس دن کی اہمیت کو دیہی علاقوں تک پہنچایا جائے تاکہ وہاں کے عوام اس دن کے حوالے سے پاکستان میں تیز رفتار اضافہ آبادی کے مضمرات سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ آج پاکستان کے شہری و دیہی علاقے بے تحاشا آبادی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگلے دس سے پندرہ سال پر نظر دوڑائیں تو پاکستان کے شہری علاقوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں آبادی کی بہبود کے لئے اپنی اپنی سطح پر ان حالات کو بہتر بنانے کے لئے عملی اقدامات اٹھانے ہونگے۔

(اعداد و شمار قومی پالیسی برائے آبادی ۲۰۱۵ء)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) ماہرین معاشیات آبادی میں اضافے سے کیوں پریشان ہیں؟

ب) آبادی میں اضافے کی رفتار میں اٹھارویں صدی عیسوی میں اضافہ کس طرح ہوا؟

ج) آپ کے خیال میں بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کیسے ممکن ہے؟

د) آبادی کی روک تھام کے لئے عوام میں شعور کیسے اُجاگر کیا جا سکتا ہے؟

ہ) آبادی میں اضافے کا دارومدار کن باتوں پر ہوتا ہے؟

و) بعض اسلامی ممالک میں آبادی پر کیونکر قابو پایا گیا؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی آبادی تھی:

(i) تین کروڑ (ii) تین کروڑ بیس لاکھ

(iii) تین کروڑ چالیس لاکھ (iv) تین کروڑ ساٹھ لاکھ

ب) پیدائش میں زیادہ اضافہ جاری رہنے کی صورت میں ۲۰۲۰ء میں پاکستان کی آبادی ہو جائے گی:

(i) دو کروڑ بیس لاکھ (ii) دو کروڑ تیس لاکھ

(iii) دو کروڑ چالیس لاکھ (iv) دو کروڑ پچاس لاکھ

ج) پاکستان میں آبادی میں اضافے کی سب سے بڑی وجہ:

(i) نقل مکانی (ii) شرح پیدائش

(iii) شرح اموات میں کمی (iv) ناخواندگی

د) دنیا میں آبادی کا عالمی دن منایا جاتا ہے:

(i) آٹھ مارچ (ii) دس اپریل

(iii) پانچ جون (iv) سولہ جولائی

ہ)	پاکستان میں لوگ غربت کی زندگی گزار رہے ہیں:

(i) ایک تہائی	(ii) ایک چوتھائی

(iii) تین چوتھائی	(iv) آدھے سے زیادہ

۳۔	متن کے مطابق درست کی نشاندہی (✓) اور غلط کی (✗) سے کریں۔

الف)	پاکستان کا شمار دنیا کے پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے۔

ب)	پاکستان میں آبادی کے مقابلے میں وسائل کی کمی ہے۔

ج)	صنعتی انقلاب سے زراعت کو فروغ حاصل ہوا۔

د)	زرعی پیداوار سے آبادی پر کنٹرول میں مدد ملی۔

ہ)	آبادی میں اضافہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔

۴۔	متن کے مطابق درست لفظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

الف)	عالمی سطح پر دنیا کی آبادی میں اضافہ.................صدی میں زرعی پیداوار بڑھنے کی وجہ سے ہوا۔

(سترہویں ۔ اٹھارہویں ۔ انیسویں)

ب)	۱۹۵۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان عالمی آبادی کم وبیش.................ہوگئی۔

(دوگنی ۔ تین گنا ۔ چار گنا)

ج)	۲۰۰۱ء کے وسط میں پاکستان کی آبادی تقریباً.................تھی۔

(ایک کروڑ چالیس لاکھ ۔ چودہ کروڑ پچیس لاکھ ۔ ایک کروڑ بیالیس لاکھ)

د)	آبادی میں اضافے کا دارومدار.................عناصر پر ہوتا ہے۔

(دو ۔ تین ۔ چار)

ہ)	جہاں ہر وقت.................بلاک رہتی ہے۔

(سڑک ۔ گلی ۔ شاہراہ)

۵۔	آبادی میں اضافے کے نتائج سے لوگوں میں شعور اُجاگر کرنے کے لیے طلبہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

۶۔	آبادی میں اضافے اور وسائل کے درمیان کیا تعلق ہے؟

۷۔	پاکستان میں شرح آبادی میں اضافہ کی مختلف وجوہات بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام منصوبہ بندی کے موضوع پر طلبہ سے مضمون تحریر کروائیں۔

۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے اخبارات و رسائل میں کوئی کہانی یا خط بنام مدیر لکھوائیں۔

۳۔ اساتذہ کرام 'منصوبہ بندی' کے موضوع پر طلبہ کے درمیان مکالمہ/ مناظرہ/ مباحثہ کروائیں۔ ساتھ ہی انھیں مکالمے/ مباحثے/ مناظرے کے آداب سے آگاہ کریں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو آبادی میں اضافے سے پیدا ہونے والے مسائل سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو پاکستان کی آبادی اور وسائل کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک کی آبادی/ وسائل سے موازنہ کر کے بتائیں۔

رتن ناتھ سرشار

(حالاتِ زندگی)

رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ کشمیری برہمن تھے۔ اور ان کا گھر لکھنؤ کے ایک ایسے محلے میں تھا۔ جہاں چاروں طرف مسلمان شرفاء رہتے تھے۔ لہٰذا انہیں مسلمانوں کے معاشرے کو قریب سے دیکھنے، ان کی بامحاورہ زبان سننے اور سیکھنے کا بہت موقع ملا۔ ان دونوں چیزوں سے انھوں نے اپنی تصانیف میں بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

سرشار نے بچپن میں عربی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کالج میں داخلہ لے کر انگریزی سیکھی۔ لیکن کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی۔ شروع میں ایک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اخباروں اور رسالوں میں مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ ان مضامین کی وجہ سے انھیں بہت شہرت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ منشی نولکشور نے انھیں ''اودھ'' اخبار کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس اخبار میں سرشار نے لکھنؤ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے کو عوام نے بہت پسند کیا اور بالآخر انھوں نے مضامین کو ایک قصے کی شکل دے کر کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ یہ کتاب ''فسانہ آزاد'' کے نام سے چار موٹی موٹی جلدوں میں چھپی اور پڑھنے والوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں یوں تو بہت سے کردار ہیں لیکن دو کردار خاص ہیں۔ ایک آزاد اور دوسرے خوجی۔ آزاد قصے کا ہیرو ہے اور خوجی اس کے وفادار دوست ہیں۔ ہر مشکل میں اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ان کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ سامنے آتے ہیں تو لوگ ان کی حرکتیں دیکھ کر ہنسی ضبط نہیں کر سکتے۔ اس کتاب کی زبان لکھنؤ کی مقامی زبان ہے جو سلیس اور بامحاورہ ہے اور ڈیڑھ سو سال بعد بھی آج استعمال ہونے والی زبان معلوم ہوتی ہے اور قارئین بڑے شوق سے اس قصے کو پڑھتے ہیں۔

اس کے علاوہ سرشار نے کئی کتابیں لکھیں۔ سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، پی کہاں اور کڑم دھم وغیرہ لیکن ان سب میں زیادہ دلچسپ ''فسانہ آزاد'' ہے۔ سرشار نے ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

تباہی، تباہی، تباہی

(رتن ناتھ سرشار)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو اُردو ادب میں ناول نگاری کی روایت سے واقفیت دلانا۔
- اُردو کلاسیکل ادب میں ''فسانہ آزاد'' کی اہمیت بتانا۔
- رتن ناتھ سرشار کے اسلوب سے متعارف کروانا۔
- ناول نگاری میں رتن ناتھ سرشار کا مقام بتانا۔

الفاظ و تراکیب

خفتگان تہہ خاک	ٹاپو	عروس	بلیغ	پینک
نا ہنجار	رقیق القلب	غرقاب	ٹی پٹی	لائف بوٹس

ناول کا پس منظر

''فسانہ آزاد'' کا شمار اُردو ادب کے شاہکار فن پاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی کہانی جنگ روم (ترکیہ) و روس کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہ جنگ روس اور روم (ترکی) کے مابین ۱۸۷۷ء میں واقع ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں ترکی اندرونی خلفشار کا شکار تھا جس کی وجہ سے عثمان پاشا کو ان سے کوئی خاص مدد نہیں مل سکی۔ مگر وہ مسلسل لڑتے رہے۔ اس جنگ میں عثمان پاشا خود لڑتے لڑتے گرفتار ہوئے۔ زار روس ان کی بہادری اور شجاعت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لہٰذا انھیں ذاتی مہمان بنایا اور بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ زار کے اس حسن سلوک کے باوجود اس کی حب الوطنی اور خودداری برقرار رہی۔ زار روس کے دربار میں شاہ رومانیہ بھی موجود تھا۔ رومانیہ ترکی کا باج گزار تھا لیکن اس جنگ کی بدولت انھوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا اور روسی افواج کی ہر طرح مدد کی تھی۔ لہٰذا جب شاہ رومانیہ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عثمان پاشا نے انھیں ایک باغی کہہ کر ہاتھ ملانے سے انکار کیا۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں باعزت رہائی ملی۔ لہٰذا وہ واپس اپنے وطن آئے جہاں انھیں غازی کے لقب سے نوازا گیا۔

ایک روز جہاز کے ناخدا نے سب کو پھر اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں بڑی سخت آندھی آنے والی ہے۔ مستعد ہو رہو۔ خبر وحشت اثر سنتے ہی سب کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ جہاز کے ناخدا نے آلہ بیرومیٹر کے ذریعے سے جہاز والوں کو بصد حزن و ملال آگاہ کر دیا کہ بہت جلد طوفانِ عظیم آنے والا ہے۔ اس ناگہانی کے دفعیہ کا انسان ضعیف البنیان میں یارا نہیں۔ مشیت ایزدی میں چارا نہیں۔

میاں آزاد کا جہاز جس کا پیارا نام جنی ڈینس تھا۔ معشوقانِ طناز کی طرح اٹھکھیلیاں کرتا جاتا تھا۔ ناخدا نے پھر اطلاع دی کہ طوفان آیا چاہتا ہے۔ بیرومیٹر سے طوفانِ عظیم کی آمد آمد صاف ظاہر ہے۔ لوگو! خبردار ہوشیار طرفۃ العین میں

مصیبت سے دو چار ہونا ہے۔ زندگی سے ہاتھ دھونا ہے۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جان کے لالے پڑے۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی جائیں تو کہاں جائیں؟ اس بحرِ ناپیدا کنار اور طوفان حسرت بار سے نجات کیوں کر پائیں۔ دل بے قرار، بے تاب تھا، زہرہ آب آب تھا۔ دیکھا کہ کپتان کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کے لیفٹیننٹ بھی سب سٹی پٹی بھول گئے۔ سیڑھیوں سے تختے پر آتے تھے اور گھبرا کر پھر اوپر چڑھ جاتے تھے اس سبب سے آتشِ غم اور بھی تیز ہوئی۔

اتنے میں ہوا نے وہ زور باندھا کہ الامان، الامان۔ ناخدا نے صرف ایک مین سیل تو بدستور رہنے دیا، باقی اور سب اتار لیے۔ اب جہاز اللہ کی راہ پر چھوڑ دیا گیا۔ موجوں کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ جہاز تھپیڑے کھا کر گیند کی طرح اُدھر سے اِدھر آتا تھا اور اِدھر سے اُدھر جاتا تھا۔ سمندر اس درجہ جوش وخروش پر تھا کہ الحذر الحذر۔ جہاز والے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے جان و مال کو رو بیٹھے۔ سمندر کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر بدن کانپ اٹھتا تھا۔ مرد وزن یا علی مدد یا خدا بچاؤ کا غل مچاتے تھے۔ بچے سہم کر اپنی ماؤں سے چمٹے جاتے تھے۔ کوئی عورت منہ ڈھانپ کے روتی تھی کہ ہائے عمر بھر کی کمائی اس سمندر میں گنوائی۔ کوئی اپنے پیارے معصوم بچے کو چھاتی سے لگا کر کہتی تھی کہ اماں کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے بیٹا ہم تم سے اور تم ہم سے رخصت ہوتے ہو۔ وہ نادان مسکراتا تھا اور اس بھولے پن سے اپنی مادر مہربان کے دل پر بجلیاں گراتا تھا۔

اب سنیئے کہ جہاز بھر میں تو کہرام مچا تھا مگر خوجی افیمی لمبی تانے سو رہے تھے۔ اس نیند پر اللہ کی مار۔ اس پینک پر شیطان کی پھٹکار۔ میاں آزاد نے جگایا کہ خواجہ صاحب اُٹھیئے طوفان آیا ہے۔ حضرت نے لیٹے ہی لیٹے بھنبھنا کر فرمایا کہ چُپ گیدی، ہم نے خواب میں بہروپیا پکڑ پایا ہے۔ تب تو میاں آزاد جھلائے اور کس کر ایک لات لگائی۔ خوجی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے تو تلاطم کا عالم دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ سمندر کی بھیانک صورت دیکھی تو کانپ اُٹھے۔ دیکھا ہر زن ومرد مبتلائے بلا ہے، ہر سمت آہ وبکا ہے۔ پانی بلیوں اُچھلتا ہے، مفر کی کوئی صورت نہیں۔

ناخدا خوب سمجھتا تھا کہ حالت ہر گھڑی نازک ہوتی جاتی ہے۔ طوفان ہے کہ اُمنڈ چلا آتا ہے۔ موج کے تھپیڑے اس قدر بلند ہوتے تھے کہ کلیجہ بانسوں اُچھلتا تھا۔ لیکن آزمودہ کار تھا اس کی پھرتی اور استقلال سے لوگوں کو کچھ یونہی سی تشفی ہوئی تھی کہ شاید جان بچ نکلے۔ اپنے اپنے مذہب اور عقیدے کے بموجب اہل جہاز باری تعالیٰ سے دعا مانگتے تھے۔

اب سنیئے کہ جس مقام پر جہاز غرق ہونا تھا اُس کے سامنے ایک چھوٹا اور پُر فضا ٹاپو تھا۔ جزیرۂ پیرم۔ یہ جزیرہ ساحل یمن سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ طول ساڑھے چار میل عرض دو میل۔ سطح بحر سے ۲۳۰ فٹ بلند۔ اس کے گوشہ

جنوب و مغرب میں ایک نہایت دلکش بندرگاہ ہے۔ دو چار آدمیوں نے اس جزیرہ کو بصد حسرت دیکھ کر کہا کہ ہائے اللہ جانے یہ کون سا ٹاپو ہے؟ آزاد خوب واقف تھے کہ یہ جزیرہ پیرم ہے۔ انھوں نے کئی یورپین سیاحوں سے کہا تھا کہ اگر اس جزیرے میں کوئلے کا بندوبست ہو تو خوب بات ہے مگر اکثروں نے جواب دیا کہ جزیرۂ مذکورہ میں پانی کی عنقائیت ہے۔ یہ جزیرہ جہاز والوں کو ترساتا تھا اور سب کے سب دست بہ دعا تھے کہ یاالٰہی کسی طرح اس ٹاپو تک جہاز مع الخیر پہنچ جائے۔ تیری بندہ نوازی کے صدقے ہمیں جزیرہ تک پہنچادے۔

اتنے میں ناخدا نے حکم دیا کہ All Hands Ahoy

اس جگر خراش فقرے سے جہاز میں کہرام مچ گیا۔ صدائے ماتم ہر گوشہ سے بلند ہوئی۔ جہاز کے مسافروں کی پریشانی اور مایوسی دو چند ہوئی۔ پاؤں خواب آلود ہوئے۔ جسم شعلے کی طرح تھرانے لگا۔

ناخدا نے پھر پکار کر کہا All Hands Ahoy۔

یعنی جتنے آدمی جہاز میں ہیں سب معاً عرشے پر آجائیں۔ اہل جہاز نے شور الامان بلند کیا تو یہی معلوم ہوا کہ ادھر حاملان عرش اور ثور فلک اور اِدھر خفتگانِ تہ خاک اور گاؤ زمین کانپ اُٹھے۔ ہر فرد بشر کے چہرے پر بے کسی برستی تھی۔

آزاد فرخ نہاد تو ایک جری اور دلیر آدمی تھے کوشش بلیغ کی کہ بنی نوع انسان کی جان بچائیں۔ کپتان اور اس کے اسسٹنٹ اور اہل جہاز سب آزاد کے عاشق تھے۔ ایک قسم کی دلی محبت ہوگئی تھی۔ آزاد نے سعی مشکور کی کہ اہل جہاز ڈوبنے سے بچ جائیں۔ مگر یہ خیال محال تھا۔ کپتان نے اس وقت بڑی مایوسی سے کہا کہ کیا اس وقت یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں جو میرے اسسٹنٹوں کو مدد دے اور بندگانِ خدا کی جان بچائے۔ میں تو جی کڑا کر کے جان بچانے میں کوشش موفور کر رہا ہوں۔ ''اَلسَّعْیُ'' مِنِّی وَالْاِ تْمَامُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی''☆۔

پھر کپتان نے غل مچا کر کہا Lower The Life Boats

واضح ہو کہ ہر جہاز کے ساتھ چند لائف بوٹ ہوتی ہیں، رسیوں اور زنجیروں سے جکڑی ہوئی۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ لائف بوٹ سے مدد لی جائے۔ لائف بوٹ جہاز کے غرقاب ہونے کے وقت کام آتی ہیں۔ ناخدا نے کہا کہ لائف بوٹ جو اس جہاز کے ساتھ ہیں ان کو نیچا کرو۔ آزاد نے اس میں بڑی مدد دی۔

اب جہاز ڈوبنے ہی کو تھا۔ دس فٹ سے زیادہ پانی جہاز کے ہولڈ میں آگیا تھا۔ آزاد نے کپتان سے کہا کہ پانی کو پمپ کے ذریعے سے نکالو ورنہ غضب ہی ہو جائے گا۔ کپتان نے کہا کہ پمپ کے ذریعہ سے پانی نکالنا بیکار ہے۔

☆ ترجمہ: کوشش میری جانب سے اور پورا کرنا اللہ کے ذمے۔

آزاد: کیوں؟

کپتان: پہلے تو آندھی کا ذرا بھی گمان نہ تھا۔ دفعتہً طوفان جو آیا تو امواج بحر پہاڑ کی بلند چوٹی کے برابر اونچی ہونے لگیں۔ جو شے تختے پر تھی سب کو بہا لے گئیں۔

آزاد نے کپتان کی بڑی تعریف کی اور لائف بوٹ کو نیچا کیا۔ اس وقت آزاد کی پھرتی اور ہمدردی اور سچی شجاعت کے اہلِ جہاز تہہ دل سے مداح تھے اور وینشیا اس جری نوجوان کو حسرت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ آزاد نے بہت سے لڑکوں اور عورتوں کو لائف بوٹ میں جگہ دی۔ اس کام میں جو اس کی سچی ہمدردی اور بسالت پر دال تھا اس کی جان خود معرض خطر میں تھی مگر آزاد کی ہمت اور شجاعت اعلیٰ درجہ کی تھی۔

آزاد اس وقت عورتوں اور بچوں کو مدد دے رہے تھے کہ وہ جہاز سے لائف بوٹ میں کود آویں۔ انھوں نے کسی کی نہ سنی۔ پھر وینشیا نے بصد حسرت ان کو بآواز بلند پکارا۔

آزاد اور سب کو چھوڑ کر وینشیا کی طرف آئے اور ان کو اٹھا کر لائف بوٹ کی طرف لے گئے۔ وینشیا نے کہا کہ پیارے آزاد میری جان سے زیادہ پیارے اپیلٹن کو تو لاؤ۔ اتنے میں اپیلٹن بھی آیا۔ وینشیا اور اپیلٹن دونوں لائف بوٹ میں کودے اور آزاد نے فرط طرب سے تین بار کہا:

Hip, Hip Hurrah

دوسرے لائف بوٹ میں بھی آزاد کی کوشش موفور سے کئی آدمی کودے۔ جہاز کے کپتان نے جہاز کو اس وقت چھوڑا جب تین بار چکر کھا کر وہ غرقاب ہونے کو تھا۔ ناخدا لائف بوٹ میں کودا تو میاں آزاد نے بآواز بلند کہا:

Save the compass anble you to steer for the land

یعنی کمپاس اپنے ساتھ لیتے آؤ تا کہ اس کے ذریعے سے لائف بوٹ خشکی کی طرف جا سکیں۔ ناخدا نے کمپاس لیا۔ جزیرہ پیرم سامنے نظر آتا تھا مگر فرط یاس سے کسی کو اُمید نہ تھی کہ وہاں تک پہنچ سکیں گے۔

پیرم کے باشندے بمقتضائے ہمدردی انسانی نہایت حسرت اور غایت ملال کے ساتھ دیکھتے تھے کہ ایک جہاز ڈوب رہا ہے۔ ان لوگوں نے جزیرے کے ساحل پر خوب تیز روشنی کی اور کئی من تیل برابر ڈالتے گئے تا کہ شعلے بلند ہوں اور اہل جہاز نے اگر یاس وغم اور پریشانی کے سبب سے اس جزیرے کو نہ دیکھا ہو تو روشنی سے سمجھ جائیں کہ زمین ہے۔ تین مختلف مقامات پر آگ جلائی گئی۔ صدہا آدمی اس واقعہ ہوشربا کے دیکھنے کے لیے اپنے اپنے مکان چھوڑ کر ساحل بحر پر آن کھڑے ہوئے تھے اور غل مچا رہے تھے۔ اکثر رقیق القلب آدمی پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے اور تہہ دل سے

آرزومند تھے کہ جہاز ڈوبنے سے بچ جائے مگر بعض ذات شریف اس مصیبت کو دیکھ دیکھ کر کھلے جاتے تھے کہ سویرے منہ اندھیرے گھرے ہیں خوب رقمیں چیریں گے، یہ شقی القلب بدکردار، نا ہنجار مارے خوشی کے تالیاں بجاتے تھے۔ جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے اور باہم خوش خوش گپیں اڑاتے تھے۔

ایک لہر آئی۔ جہاز تہ و بالا ہونے لگا۔ وہ گئی تو دوسری آئی۔ ہنوز جہاز سنبھلنے نہ پایا تھا کہ تیسری موج کے تھپیڑوں نے آفت ڈھائی۔ میاں آزاد بکمال شجاعت و استقلال پھر جہاز پر کودنے ہی کو تھے کہ ناخدا نے میاں خوجی کو بھی ان کے لائف بوٹ میں بہزار خرابی پہنچایا۔ آتے ہی انھوں نے غل مچایا کہ ارے یارو، افیم کی ڈبیا تو وہیں رہ گئی۔ میاں کوئی بندۂ خدا ذرا لپک کے ہماری ڈبیا لے آئے۔ آزاد کو جو پایا تو چمٹ گئے۔ بھائی آزاد جب اتنا بڑا جہاز نہ بچ سکا تو یہ ننھی ننھی کشتیاں بھلا کیوں کر بچیں گی۔ آزاد نے کہا، اللہ مالک۔ جب زور سے آندھی آتی ہے تو تناور درخت بھی پھٹ پڑتے ہیں کبھی کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ آندھی چلنے سے گھاس ٹوٹ گئی۔

آزاد جزیرہ پیرم کے ساحل پر آئے اور آتے ہی مارے تھکاوٹ کے گر پڑے۔ کپتان اسمتھ اور اپیلٹن نے آزاد کی پیٹھ ٹھونکی۔

وینشیا نے بصد ادائے دلربا میاں آزاد کا شکریہ ادا کیا اور کہا تمام عمر تمہاری مشکور ہونگی کہ تم نے میرے شوہر کی جان بچائی۔

اپیلٹن نے آزاد سے کہا کہ اب اس وقت مجھ سے اور کچھ نہیں کہا جاتا۔ صرف اس قدر کہتا ہوں کہ ضرورت کے وقت جان جوکھم کے وقت مجھ کو ضرور یاد کرنا۔ اپیلٹن کو اب اپنا درم ناخریدہ غلام سمجھو۔

وینشیا: آزاد جیسے بہن کو اپنے بھائی کی محبت ہوتی ہے ویسی ہی مجھ کو تمہاری محبت ہے۔

آزاد: اب اس وقت کوئی اس قدر تشفی کر دے کہ میں تم کو اور تمہارے پیارے شوہر کو پھر بھی دیکھوں گا، تو میں جی اُٹھوں گا۔

(فسانۂ آزاد)

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) جہاز میں سوار لوگوں کے ہوش و حواس کیوں اُڑ گئے؟

ب) دورانِ طوفان ناخدا نے کیا تدابیر اختیار کیں؟

ج) طوفان کا خوجی پر کیوں کوئی اثر نہیں ہوا؟
د) جہاز کا عملہ اور مسافر آزاد سے کیوں محبت کرتے تھے؟
د) جہاز کا انجام کیا ہوا؟
ؤ) وینشیا آزاد کو کیوں حسرت کی نظر سے دیکھتی تھی؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) جزیرہ پیرم ساحل یمن سے فاصلے پر تھا۔

(i) تین میل (ii) چار میل (iii) پانچ میل (iv) چھ میل

ب) خوجی ایک انسان تھا:

(i) لاپروا (ii) بہادر (iii) ذمہ دار (iv) بزدل

ج) طوفان کے اعلان کے ساتھ ہی لوگ ہو گئے:

(i) چوکنا (ii) پریشان (iii) بے فکر (iv) مطمئن

د) اس کہانی کا ہیرو تھا:

(i) خوجی (ii) اسپلٹن (iii) اسمتھ (iv) آزاد

ہ) اسپلٹن اور وینشیا کا تعلق تھا:

(i) میاں بیوی کا (ii) بھائی بہن کا
(iii) والد بیٹی کا (iv) خالہ زاد بہن بھائی کا

۳۔ متن کے مطابق درست کی نشان دہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) جہاز کا کپتان بہت بہادر آدمی تھا۔
ب) دورانِ طوفان خوجی جاگ رہا تھا۔
ج) لائف بوٹ جہاز کے غرقاب ہونے کے وقت کام آتی ہیں۔
د) وینشیا نے اپنے شوہر کی جان بچانے پر آزاد کا شکریہ ادا کیا۔
ہ) کپتان اسمتھ آزاد سے حسد کرتا تھا۔

۴۔ متن کے مطابق خالی جگہ درست لفظ سے پُر کریں۔

الف) آزاد ایک.................آدمی تھا۔ (لاپروا ۔ بزدل ۔ دلیر)

ب) جہاز............ کی مدد سے خشکی کی طرف جاتا تھا۔ (کمپاس ۔ بیرومیٹر ۔ دوربین)

ج) فسانۂ آزاد کے مصنف کا نام .... ہے۔ (کرشن چندر ۔ رتن ناتھ سرشار۔ پریم چند)

د) فسانۂ آزاد صنفِ ادب کے لحاظ سے .... ہے۔ (ڈرامہ ۔ افسانہ ۔ ناول)

۵۔ طوفان کے آغاز کے ساتھ جہاز میں سوار مسافروں کی حالت اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۶۔ فسانۂ آزاد کے منتخب میں شامل اقتباس کا خلاصہ تحریر کریں۔

۷۔ آزاد کی شخصیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۸۔ ناول میں خوجی کے کردار پر نوٹ لکھیں۔

۹۔ اگر آپ جہاز میں سوار ہوتے تو کیا محسوس کرتے؟

۱۰۔ سیاق و سباق کے حوالے سے متن کی تشریح کریں۔

بیرم کے باشندے بتقاضائے ہمدردی .... خوش گپیں اُڑاتے تھے۔

تحریری سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مختلف معاشرتی مسائل پر مشتمل مضامین لکھنے کی مشق کروائیں۔

۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کو کوئی کہانی / مکالمہ سنا کر اس کی جزئیات کو ترتیب سے باری باری سنیں۔

۳۔ رتن ناتھ سرشار کے ناول "فسانۂ آزاد" سے کوئی اور اقتباس سنیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اردو کلاسیک نثر میں "فسانۂ آزاد" کی اہمیت پر تفصیلی لیکچر دیں۔

۲۔ طلبہ کو اردو کلاسیکل نثر کی اہمیت بتائیں۔

۳۔ رتن ناتھ سرشار کے طرزِ تحریر کی خوبیاں بتائیں۔

خدیجہ مستور

(حالات زندگی)

خدیجہ مستور ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ وہیں سے تعلیم مکمل کی۔ کچھ عرصہ بمبئی میں قیام رہا۔ ۱۹۴۲ء میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ابتدائی کہانیاں لاہور کے ادبی رسالے ''عالمگیر'' اور ''خیام'' میں شائع ہوئیں۔ اس دور کے افسانوں کے دو مجموعے ''کھیل'' اور ''بوچھاڑ'' کی صورت میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئیں اور ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' سے وابستہ ہوئیں اور انجمن کی لاہور شاخ کی سیکرٹری بھی مقرر ہوئیں۔ اس فکری وابستگی کے اثرات ان کے تیسرے افسانوی مجموعے ''چند روز اور'' میں دکھائی دیتے ہیں۔

ان کا مشہور افسانہ ''محافظ الملک'' ایک خاص دور کے ذہنی رجحان اور فضا کا عکاس ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں ''تلاش گمشدہ'' اور ''درد میں بیزاری'' اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں جو خارجی ماحول کے انتشار کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے ہر ہلکے سے ہلکے تنفس کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ ابتداء میں ان کے افسانوں کے تین مجموعے ''کھیل، بوچھاڑ'' اور ''چند روز'' چھپ گئے جبکہ چوتھا اور پانچواں مجموعہ آخری وقت میں شائع ہوا۔

۱۹۵۰ء کے بعد کے پاکستانی معاشرے میں اقدار کی ٹوٹ پھوٹ ان کے چوتھے مجموعے ''تھکے ہارے'' کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۲ء ان کا فن اپنے عروج پر تھا۔ اس دور میں انھوں نے کئی لازوال اور ناقابل فراموش کردار تخلیق کیے۔ ہر کردار اپنے طبقے کی زندگی کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے افسانوں کا آخری اور پانچواں مجموعہ ''ٹھنڈا پانی'' ہے جس پر اکادمی ادبیات پاکستان کا ادبی انعام (۴۰ ہزار روپے) دیا گیا۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے دو ناول بھی تحریر کیے۔ پہلے ناول ''آنگن'' کا موضوع تحریک پاکستان ہے اور اس کا شمار اردو کے معیاری اور اچھے ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس ناول کو ۱۹۶۲ء کا آدم جی ادبی ایوارڈ بھی ملا، دوسرا ناول ''زمین'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۸۲ء کو لندن میں انتقال ہوا۔

آنگن

(خدیجہ مستور)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ میں اپنے ملک سے جذبہ محبت کو اُجاگر کرنا۔
- قیامِ پاکستان کا سیاسی پس منظر بتانا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں خواتین قلم کاروں کے بارے میں مختصراً بتانا۔
- طلبہ کو ناول کی فنی تراکیب سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو خدیجہ مستور کے نثری اسلوب سے آگاہ کرنا۔

الفاظ و تراکیب

آنگن	سیاسی آویزش	گوڈا	سنیچر	اشتیاق
میکے	جی اُمنڈنا	روڑے اٹکانا	کھسیانا	جھلا اُٹھنا

ناول کا پس منظر

آدم جی ادبی انعام یافتہ ناول ''آنگن'' قیامِ پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ''آنگن'' میں ہندوستان کے ایک مسلمان گھرانے کی زندگی کے حالات بیان ہوئے ہیں اور اس امر کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ افراد کی زندگیوں پر گرد و پیش میں رونما ہونے والے سماجی اور سیاسی واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں مسلمان اشراف گھرانوں میں گھریلو زندگی کی جھلک، طبقہ نسواں کی جذباتی زندگی اور دوسرے کرداروں کی نفسیات کو مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا موضوع تقسیم سے ذرا پہلے اور تقسیم کے بعد کا وہ مختصر زمانہ ہے جب جنوبی ایشیا کے مسلمان ہجرت کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا تھے اور ملک کے طول و عرض میں جا بجا انسانی خون ارزاں ہو گیا تھا۔

ناول کے اس حصے میں ذیل کردار آتے ہیں:

کریمن بوا: گھر کا کام کاج کرنے والی پرانی ملازمہ۔

بڑی چچی: ہمدرد اور مہربان خاتون بڑے چچا کی بیوی۔

شکیل: بڑے چچا کا بیٹا جو گھر سے بھاگ جاتا ہے۔

چھمی: بڑے چچا کی بھتیجی، مسلم لیگ اور پاکستان کی پرجوش طرف دار مگر وہ پاکستان نہیں آتی۔

ساجدہ آپا: جمیل کی بڑی بہن۔

اسرار میاں: بڑے چچا کا سوتیلا بھائی جس کی گھر میں کوئی اہمیت نہیں ایک قابلِ رحم کردار۔

نجمہ پھوپھی: ایک خود پسند عورت جس کے لیے ایم اے انگریزی ہونا سب سے بڑی بات ہے۔

اماں: عالیہ کی مغرور ماں۔

صفدر: بڑے چچا کا بھانجا۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور بہار نے دنوں کو پھلانگ کر پھول کھلا دیئے ہیں۔ ایک ڈیڑھ مہینے پہلے کریمن بوا نے کیاری کا کوڑا صاف کر کے اسے گھٹنے تک گوڈا تھا اور پھر بیج بو کر اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب کھلے ہوئے پھول دیکھ کر وہ خوش ہو رہی تھی، مگر بڑی چچی سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ دو پھول توڑ کر اس گرد سے بھرے ہوئے گلدان کو صاف کر کے سجا دیں۔ ان کے دل میں بہار کا گزر نہ تھا، پھولوں میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ شکیل ان کے دل میں سدا خزاں کا بیج بو گیا ہے۔ جمیل بھیا اس بیج کو سینچ رہے ہیں اور بڑے چچا، بڑے چچا کے لیے اسے کوئی بری بات نہ سوچنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتی۔ گھر کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی جمیل بھیا نے ملازمت کی کوشش ہی نہ کی، سارا دن مسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتے اور تھوڑا سا معاوضہ مل جاتا۔ بڑی چچی کو یہ معاوضہ دے کر وہ سارے مہینے کے لیے بے خبر ہو جاتے اور سارا مہینہ بڑی چچی سے انتقام لے لے کر گزر جاتا۔

ان دنوں بڑے چچا کے پیروں میں سنیچر ہو گیا تھا آج یہاں، کل وہاں، انگلستان کی لیبر وزارت نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اماں نے یہ خبر اس طرح سنی تھی جیسے چنڈو خانے سے اڑائی گئی ہو۔ اِدھر آزادی کے فیصلے کے ساتھ باپ بیٹے ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو گئے تھے۔ پاکستان بنے گا، پاکستان نہیں بنے گا اور اس کشمکش کے عالم میں اسے چھمی بُری طرح یاد آنے لگتی۔ اگر آج وہ بھی اس گھر میں بیٹھی رہتی تو کیا ہوتا۔ آزادی ملنے سے پہلے ہی سب اپنا اپنا سر پھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو چکے ہوتے۔

آج پندرہ بیس دن بعد بڑے چچا گھر داخل ہوئے تھے اور برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگ پر سکون سے لیٹے اپنا سر سہلا رہے تھے، اتنے دن بعد انھیں گھر میں لیٹے دیکھ کر عالیہ چائے کی پیالی لے کر ان کے پاس جا بیٹھی بڑے چچا اُٹھ کر چائے پینے لگے۔

''انگریز کہتے ہیں کہ اب ہندوستان آزاد ہو جائے گا؟'' بڑی چچی بھی ہنستی ہوئی آ گئیں۔

''ہاں انھیں آزاد کرنا ہی ہوگا، بس تھوڑے دن اور گڑبڑ کریں گے، بے ایمان قوم ہے۔'' بڑے چچا جوش میں آ گئے۔

''پھر جب آزادی مل جائے گی تو تم اپنی دکانوں پر بیٹھو گے؟'' بڑی چچی نے پوچھا۔ ان کی آنکھوں سے اشتیاق ٹپک رہا تھا۔

''بیٹھوں گا کیوں نہیں، تم دیکھنا کہ اس کے بعد دکانیں کیسی چلتی ہیں، اپنی حکومت سے تو دکانوں کو چلانے کے لیے امداد بھی مل جائے گی۔''

''اچھا اپنی حکومت امداد بھی کر دے گی؟ ہائے کتنا اچھا ہوگا'' بڑی چچی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''بڑے چچا آج آپ گھر میں لیٹے اچھے لگ رہے ہیں، جب آپ ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے۔'' عالیہ کچھ نہ کہہ سکی اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

''اور میں تمہارا باپ نہیں تو پھر کیا ہوں پگلی۔'' بڑے چچا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا ''اور جب آزادی مل جائے گی تو میں اپنی بیٹی کو دلہن بناؤں گا اور بہت شاندار پڑھا لکھا دولہا لاؤں گا، ایں نا؟'' انھوں نے بڑی چچی کی طرف دیکھا وہ دونوں ہنسنے لگے مگر عالیہ بڑے چچا کے سینے میں محبت کی گرمی محسوس کر کے دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ اس ملک کو جلدی سے آزاد کر دے، بڑے چچا اپنے گھر واپس آ جائیں اور پھر شام کو اسی گھر میں لیٹ کر بڑی چچی سے باتیں کریں۔ چھمی کی خیریت پوچھیں، ساجدہ آپا کو میکے آنے کے لیے خط لکھیں، جمیل بھیا کے لیے دلہن تلاش کریں اور شکیل کو ڈھونڈ کر گھر لے آئیں۔

''اری پگلی رو رہی ہے''۔ بڑے چچا نے اپنے کھدر کے کُرتے کے پار آنسوؤں کی نمی محسوس کر لی تھی۔ ''مت رو میری بیٹی۔''

''کریمن بوا بڑے بھیا سے کہو کہ حکیم صاحب اور ہر دیال بابو آئے ہیں۔'' اسرار میاں کی آواز آئی تو بڑے چچا ایک دم اٹھ پڑے، وہ اسے چپ کرانا بھی بھول گئے۔ عالیہ نے آپ ہی آپ آنسو پونچھ ڈالے، کیسا جی امنڈ رہا تھا ابھی تو وہ رونا چاہتی تھی۔ رات جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو جمیل بھیا بڑے جوش و خروش سے بولتے جا رہے تھے۔ مطالبہ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جیسے آپ بیٹھے ہیں، کانگریسی لاکھ روڑے اٹکائیں مگر کچھ نہیں کر سکتے، دس کروڑ مسلمانوں کے اس مطالبے کو کون روک سکتا ہے۔

''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟'' بڑی چچی نے پوچھا۔

''واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی، جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔''

''مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے مُلک جاؤ۔''

''ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔''

جمیل بھیا کی دلیل بڑی چچی کی سمجھ میں آ گئی تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔

''ہاں جمیل میاں یہ جانے والے کی بات بُری ہے، میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔'' کریمن بوا بھی بول ہی پڑیں۔

''اور میں کب چھوڑ رہا ہوں اپنا گھر، میں تو بس اسرار میاں کو بھیج دوں گا پاکستان'' جمیل بھیا مزے میں آ کر

ہنسے اور کریمن بوا نے کھسیا کر برتن اٹھانے شروع کر دیئے۔

''پھر تم اپنی ایک دکان تو سنبھال ہی لینا، تمہارے ابا اب تھک چکے ہیں اور پھر تم ان کا ادب بھی کرو گے نا؟''

''میں سب کچھ کروں گا اماں، جو کچھ آپ کہیں گی وہی ہوگا بس پاکستان بن جانے دیجئے۔'' جمیل بھیا باتیں کرتے ہوئے بار بار عالیہ کی طرف دیکھے جا رہے تھے اور وہ بے تعلق سی بیٹھی کھانا کھائے چلی جا رہی تھی۔ ''جانے آج کل اتنی بھوک کیوں لگتی ہے۔''

''حد ہے ہر وقت یہی باتیں، کھانا پینا حرام ہو گیا ہے۔'' اماں باتیں سن سن کر ایک دم جھلا اٹھیں۔ بس اب تو عقل مند صرف تمہارے ملک کے لوگ رہ گئے ہیں، انگریز بیچارے تو بڑے بے وقوف ہیں کہ آزادی بانٹی اور چپکے سے اپنے ملک لوٹ گئے، ارے ابھی تو برسوں جھک مارو جب بھی آزادی نہیں ملتی۔

''انھیں کون کافر بے وقوف سمجھتا ہے مگر اب وقت انھیں بے وقوف بننے پر مجبور کر رہا ہے، اگر نہ گئے تو نکال دیئے جائیں گے۔'' جمیل بھیا بھی جوش میں آ گئے۔

''اللہ کی شان ہے کیا بڑھ بڑھ کر بھڑکیں مار رہے ہو''۔ اماں بگڑ کر اٹھ گئیں۔ ''کریمن بوا میرا کھانا میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' اماں جانے لگیں تو جمیل بھیا نے پکڑ لیا۔ ''چلئے چھوڑیئے چھوٹی چچی، اب اگر آزادی کا نام بھی لوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

بات نداق میں ٹل گئی مگر موڈ ٹھیک نہ ہوا کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

سردی کا زور گھٹتے ہی سب برآمدے میں سونے لگے تھے پھٹے ہوئے پردے لپیٹ کر کب کے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس وقت چاندنی برآمدے میں داخل ہو کر بستروں پر لوٹ رہی تھی۔

جمیل بھیا اتنی بہت سی باتیں کرنے کے بعد اب صحن میں ٹہل رہے تھے اور عالیہ بڑی چچی کے پاس بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھی اماں سب سے روٹھ کر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔

''بڑے بھیا کہاں ہیں؟'' نجمہ پھوپھی اوپر سے آ کر بڑی چچی کے پاس ٹک گئیں وہ کچھ فکر مند سی نظر آ رہی تھیں۔ ''بیٹھک میں ہوں گے بلوا لو۔'' بڑی چچی نے جواب دیا۔

''دیکھو کریمن بوا اگر کوئی نہ ہو تو بلا لاؤ۔'' نجمہ پھوپھی نے اکتا کر کہا۔

بڑے چچا کے آتے ہی جمیل بھیا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عالیہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آج نجمہ پھوپھی کیا بات کرنا چاہتی ہیں جو اس قدر فکر مند ہو رہی ہیں؟

''بڑے بھیا وہ بات یہ ہے کہ میں نے اپنے لیے زندگی کا ساتھی تلاش کر لیا ہے، بس آپ کو اطلاع دینی تھی۔'' انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

سب حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگے، بڑے چچا آنکھیں جھکائے خاموش بیٹھے تھے، کیا انگلش میں ایم اے کر کے انسان اپنی تہذیب پر لات مار دیتا ہے۔ نجمہ پھوپھی یہی کچھ بڑی چچی کے ذریعے بھی کہلا سکتی تھیں۔ عالیہ نے نفرت سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

تو پھر ضرور کر و شادی، ہم سے کہو فوراً انتظام کر دیں گے۔ بڑی چچی کھسیا کر ہنسنے لگیں۔

''کیا انتظام کریں گے آپ، کیا میں چھمی ہوں جس کی شادی پر میراثنیں بلائی جائیں گی، ڈھول پیٹی جائے گی اور میرا جہیز سلے گا میں خود جہیز ہوں۔'' نجمہ پھوپھی سخت مغرور ہو رہی تھیں۔

''تم جب کہو گی میں شریک ہو جاؤں گا۔'' بڑے چچا اٹھ کر باہر چلے گئے۔

''بس گرمیوں کی چھٹی میں نکاح ہو جائے، پھر ہم لوگ شملے چلے جائیں گے۔'' نجمہ پھوپھی نے بڑی چچی کو اطلاع دی اور خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''وہ ہیں کون صاحب؟'' بڑی چچی سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

''ہمارے کالج کے لیکچرار کے بھائی ہیں، انھوں نے بھی انگلش میں ایم اے کیا ہے۔ بہت زبردست تاجر ہیں۔'' وہ کھٹ پٹ کرتی زینوں پر ہو لیں۔

ذرا دیر تک سب چپ رہے کوئی کسی سے نہ بولا مگر جیسے ہی جمیل بھیا پھر سے آ کر ٹہلنے لگے تو بڑی چچی نے دھیرے سے اطلاع کر ہی دی۔ ''تمہاری نجمہ پھوپھی شادی کر رہی ہیں۔''

''اچھا تو اس وقت وہ یہی کچھ بتانے آئی تھیں؟''

''ہوں!'' بڑی چچی سر جھکا کر پان بنانے لگیں۔

''ڈھول نہ باجے، دلہن نہ بنیں، یہ بھی کوئی شادی ہوئی زمانے بدل گئے سوا سوا مہینے تک لڑکی کو مانجھے بٹھاتے تھے۔ باپ بھائیوں کا سایہ تک نہ دیکھتی تھی۔'' کریمن بوا برتن دھوتے ہوئے برابر بڑ بڑائے جا رہی تھیں۔

''پڑھ لکھ کر انھوں نے اتنا ہی سیکھا ہے۔ قاضی سے کہنا کہ نکاح بھی انگریزی میں پڑھائے۔'' جمیل بھیا زور سے ہنسے۔

''واقعی اس خاندان کی بدنصیبی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم نہ دلائی گئی۔ اب ہماری نجمہ پھوپھی خاندان کی پہلی لڑکی تھیں، جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ظاہر ہے کہ انھیں مارے غرور کے یہی کچھ بننا تھا۔ دوسری تعلیم یافتہ خاتون ہماری

عالیہ بی بی ہیں، کچھ فتور تو ان میں بھی ہے۔" انھوں نے دادطلب نظروں سے دیکھا۔

عالیہ سمجھ گئی کہ یہ کس فتور کی طرف اشارہ ہورہا ہے، اس کی جان جل کر رہ گئی۔ "جی ہاں عورت اگر کٹھ پتلی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو ظاہر ہے کہ دماغی فتور سمجھا جائے گا، مرد عورت کو بے وقوف دیکھ کر ہی سچی خوشی محسوس کرتا ہے۔ نجمہ پھوپھی کا طریقہ غلط ہے مگر انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی شادی کریں۔"

"کون کررہا ہے شادی؟" اماں نے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

"نجمہ پھوپھی۔" عالیہ نے جواب دیا۔

"کہاں انتظام کردیا بڑے بھیا نے؟"

"بڑے بھیا نہیں انھوں نے خود انتظام کیا ہے۔" بڑی چچی نے بتایا۔

"حد ہے بھئی ان کی بڑی بہن صاحبہ نے بھی تو اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور آج ان کا شاندار بیٹا صفدر دنیا کی چھاتی پر دندناتا پھرتا ہے۔" اماں کا غصہ پورے جوش پر تھا۔

سب چپ رہے، کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ عالیہ کو افسوس ہورہا تھا کہ اماں اتنی تلخ باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جمیل بھیا اٹھ کر ٹہلنے اور گنگنانے لگے۔

؎ بہلا نہ دل نہ تیرگی شامِ غم گئی یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

ٹھیک ہے اسی لیے میرے دماغ کے فتور کا رونا رویا جارہا تھا وہ ان کا دل نہ بہلا سکی، وہ ان کی شاموں کو رنگین نہ بنا سکی اس سے بڑھ کر اور کیا فتور ہوگا؟

"میں ذرا باہر جارہا ہوں اماں ضروری کام سے، دیر سے آؤں گا، دروازہ بند کرلیجیے" جمیل بھیا نے کہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

؎ بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی

دروازے سے نکلتے ہوئے بھی وہ دھیمے دھیمے گارہے تھے۔

دھوم دھام سے چٹکی ہوئی چاندنی میں اسرار میاں کی اندھیری آواز ابھری۔ "کریمن بوا اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو۔"

عالیہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے زینوں پر ہولی۔

(آنگن سے اقتباس)

مشق

۱) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) بڑی چچی کیوں اُداس رہتی تھی؟

ب) باپ، بیٹا ایک دوسرے کی صورت سے کیوں بیزار ہو گئے تھے؟

ج) نجمہ پھوپھی نکاح کے بعد کون سے شہر جانا چاہتی تھی؟

د) جب بڑی چچی کو قیام پاکستان کی صورت میں ہجرت کا خدشہ لاحق ہوا تو جمیل بھیا نے کس طرح اُنہیں مطمئن کیا؟

ہ) بڑے چچا کے پیروں میں کیا ہوا تھا؟

و) ''بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی''، جمیل بھیا کیوں یہ مصرعہ بار بار گا رہا تھا؟

ز) بڑے چچا نے عالیہ کو سینے سے لگایا تو عالیہ نے دل میں کس خواہش کا اظہار کیا؟

۲) متن کو مدنظر رکھتے ہوئے دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ''آنگن'' کی مصنفہ/مصنف کا نام ہے۔

(i) مرزا ادیب (ii) خدیجہ مستور (iii) سجاد حیدر یلدرم (iv) قرۃ العین حیدر

ب) گھر سے بھاگ جانے والے بڑے چچا کے بیٹے کا نام تھا۔

(i) صفدر (ii) جمیل بھیا (iii) شکیل (iv) اسرار میاں

ج) جمیل بھیا کی رائے کے مطابق قیام پاکستان کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔

(i) کانگریسی (ii) انگریز (iii) ہندو (iv) سکھ

د) عالیہ کی ماں مزاجاً ایک عورت تھی۔

(i) عاجز (ii) نرم مزاج (iii) مغرور (iv) ہمدرد

ہ) نجمہ پھوپھی کی شادی کے اچانک اعلان نے سب کو کر دیا۔

(i) حیران (ii) پریشان (iii) خوش (iv) فکرمند

۳) خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کے کتاب میں شامل اقتباس کا خلاصہ بیان کریں۔

۴) عالیہ اور جمیل بھیا کے کرداروں پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۵) درج ذیل محاورات کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

آواز بھر آنا۔ جی اُمنڈنا۔ روڑے اٹکانا۔ دندناتے پھرنا۔ مُنہ تکنا۔ ڈھول پیٹنا۔ اشتیاق ٹپکنا۔ بات ٹل جانا۔

ناول اور اس کے اجزائے ترکیبی

تعریف:۔ ناول اُس نثری قصے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی اور واقعاتی عکاسی کی گئی ہو۔ ناول کا مرکزی کردار اس کا ہیرو ہوتا ہے۔ واقعات میں ایک تسلسل موجود ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری اور صداقت بیانی اس کا خاصہ ہے۔ اس کا موضوع انسانی زندگی ہوتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے حالات و واقعات اور معاملات کو انتہائی گہرے اور مکمل مشاہدے کے بعد کہانی کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ناول کے اجزاء

۱۔ کہانی:۔ ناول کے لیے سب سے بنیادی چیز کہانی ہے کیونکہ اس کے بغیر ناول کی تکمیل نہیں ہوتی۔

۲۔ پلاٹ:۔ ناول میں واقعات کو اچھے انداز میں ترتیب دے کر بیان کرنا پلاٹ کہلاتا ہے۔

۳۔ کردار:۔ ناول میں جن افراد کا ذکر آتا ہے وہ ناول کے کردار کہلاتے ہیں۔

۴۔ مکالمے:۔ کرداروں کی آپس میں بول چال مکالمہ کہلاتا ہے۔ مکالموں کے ذریعے کرداروں کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ منظر نگاری، موضوع، زبان و بیان اور مقصدیت اس کے اجزاء میں شامل ہیں۔

سرگرمیاں

۱) سبق پڑھاتے ہوئے طلبہ کو ناول کے کرداروں میں تقسیم کر کے اُن کے درمیان مکالمہ کروایا جائے۔

۲) اساتذہ کرام طلبہ سے کمرا جماعت میں کسی بھی ادبی، علمی یا صحافتی موضوع پر درست لب و لہجے اور تلفظ کے ساتھ دس منٹ تک لکھی ہوئی تقریر دیکھ کر پڑھوائیں۔

۳) طلبہ کو لائبریری لے جا کر دیگر مصنفین کے ناول پڑھنے پر آمادہ کیا جائے۔

اشاراتِ سبق

۱) طلبہ کو بتایا جائے کہ قیامِ پاکستان ایک عظیم سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں ممکن ہوسکا ہے۔

۲) طلبہ کو خدیجہ مستور کے اسلوبِ نثر سے آگاہ کیا جائے۔

۳) طلبہ کو اُردو ادب میں صنفِ ناول نگاری کی روایت پر ایک سیر حاصل لیکچر دیں۔

۴) طلبہ کو اُردو ادب میں خواتین کے کردار کے بارے میں بتایا جائے۔

آغا حشر کاشمیری

(حالاتِ زندگی)

آپ کا پورا نام محمد شاہ، لقب آغا اور تخلص حشرؔ تھا۔ ان کے والد اپنے وطن کشمیر سے بغرض تجارت بنارس آئے، جہاں آغا حشر ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعد میں فرائن مشن سکول میں داخلہ لیا۔ سکول کے زمانے ہی سے شاعری شروع کی۔ بنارس میں تھیٹر دیکھ کر ڈرامہ لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور چودہ برس کی عمر میں پہلا ڈرامہ ''آفتابِ محبت'' ایک کمپنی کے لیے لکھا اسی شوق نے انھیں بمبئی پہنچایا۔

بمبئی میں الفریڈ کمپنی کے لیے کئی مشہور ڈرامے لکھے۔ جلد ہی اِس کمپنی کے مالک نے اِنہیں ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ اِس دوران اُنھوں نے مشہور ڈرامے شہیدِ ناز، سفید خون، خوابِ ہستی، خوبصورت بلا، نیک پروین، رستم وسہراب اور پاک دامن تحریر کیے۔ اِن سے قبل اُردو ڈراموں کا دارو مدار شاعری اور موسیقی پر تھا مگر حشر نے ڈراموں میں مکالمے شامل کیے اور بڑی حد تک اسے شاعری کی قید سے آزاد کیا۔

اُردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں آغا حشر کاشمیری کا نام ہمیشہ سرِفہرست رہے گا۔ اِنہیں ہندوستان کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ڈرامے کا آغاز نثر کی بجائے نظم میں ہوا اور تماشائیوں کی دلچسپی کے لیے بار بار گانے اور رقص ضروری قرار دیے گئے لیکن آغا حشر نے اس روایت میں تبدیلی پیدا کی۔ اُن کا اعزاز یہ ہے کہ انھوں نے ایک تو ڈرامے کو کہانی دی۔ دوسرا اسے نثر کا تحفہ دیا لیکن ساتھ ساتھ اشعار کی صفت بھی موجود رہنے دی۔ ان کے مکالموں میں بہت گھن گرج نظر آتی ہے بقول صلاح الدین احمد ان کے مکالموں میں بادل کی کڑک اور بجلی کی گرج و چمک نظر آتی ہے۔ ان کے ڈراموں کے اکثر موضوعات انسانی مسائل پر مشتمل ہیں ان کے ڈراموں میں سرمایہ داروں کے ظلم وستم اور غریب کی آبروریزی کے نمونے ملتے ہیں۔ اِن پر بازاری مزاح اور گھٹیا طنز وظرافت کا الزام لگایا جاتا ہے مگر عوامی شوق کے پیشِ نظر وہ ایسے مناظر ڈراموں میں شامل کرنے پر مجبور تھے۔

آغا حشر کے ڈراموں میں ہر طبقہ کے کردار ملتے ہیں۔ اِن کے قلم کا کمال یہ ہے کہ ہر کردار اپنی معاشرتی اور طبقاتی حیثیت کے مطابق زبان بولتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے خدوخال کسی مُصور کی مانند اُبھارتے ہیں اِن کے ہاں نسوانی کرداروں کی بھرمار ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں لاہور میں وفات پائی۔

رستم و سہراب

(آغا حشر کاشمیری)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ میں ہمدردی اور سوچ و بچار کا جذبہ پیدا کرنا۔
- طلبہ کو انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا۔
- ڈرامے کے اجزائے ترکیبی سے آگاہ کرنا۔
- آغا حشر کاشمیری کے اسلوب نثر سے متعارف کروانا۔

الفاظ و تراکیب

گھات	قہر و غضب	سجدہ ہائے نیاز	فانی	ہیٹے
حقیر	نقارہ	اُلفت	ناشاد	کوکھ

پس منظر

ایران کا بادشاہ کیکاؤس اور تورانی بادشاہ افراسیاب ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ان میں اکثر جنگیں رہا کرتی تھیں۔ توران کے علاقے سمنگان میں ایک مرتبہ ایرانی پہلوان رستم کا گھوڑا داخل ہوا۔ وہ گھوڑے کی بازیابی کے لیے شاہ سمنگان کے دربار میں گیا۔ بادشاہ نے اُسے مہمان رکھا۔ اس دوران میں رستم کی شاہ سمنگان کی بیٹی تہمینہ سے شادی ہوگئی۔ رستم نے تہمینہ کو ایک مہرہ دیا تاکہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو اس کے بازو پر باندھ سکے اور ایران چلا گیا۔

تہمینہ کے بطن سے سہراب پیدا ہوا۔ جوان ہونے پر تورانیوں کی فوج میں شامل ہوا۔ انفرادی جنگ میں ایران کی طرف سے رستم جبکہ توران کی جانب سے سہراب نکلا۔ ایک سازش کے تحت باپ بیٹے کو ایک دوسرے سے اجنبی رکھا گیا۔ لیکن سہراب نے دیکھا کہ اس کے مدِ مقابل میں وہ ساری نشانیاں موجود ہیں جو باپ کے متعلق اس کی والدہ نے بتائی تھیں۔ اسی واسطے وہ بار بار نام پوچھتا تھا مگر رستم اپنا نام نہیں بتاتا۔

دونوں میں انفرادی جنگ ہوئی پہلے روز سہراب غالب رہا۔ نصاب میں اس کے بعد کا چھٹا سین شامل کیا گیا ہے۔

چھٹا سین (میدان جنگ)

(رستم اُداس چہرے اور غمگین دل کے ساتھ مایوس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے)۔

رستم: پروردگار! میں نے کبھی تیرے قہر و غضب کو حقیر نہیں سمجھا۔ کبھی تیری طاقت کے سامنے اپنی فانی طاقت کا غرور نہیں کیا۔ پھر اس ذلت کی شکل میں تو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ اے دردمندوں کی دوا اور کمزوروں کی طاقت! اے ناامیدوں کی امید! میں نے کل ساری رات تیرے حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر مدد کے لیے التجا کی ہے۔ اپنے عاجز بندے کی التجا قبول کر۔ اس بڑھاپے میں دنیا کے سامنے میری شرم رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور و جوش مجھے دوبارہ واپس دے دے۔

تیری قدرت پلٹ سکتی ہے سارے کارخانے کو
پھر اک دن کے لیے تو بھیج دے پچھلے زمانے کو

سہراب: صبح ہوگئی ممکن ہے یہ آج کی صبح اس کی زندگی کی شام ثابت ہو۔ نہ جانے کیا سبب ہے کہ اس کی موت کا خیال آتے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے (رستم کو دیکھ کر) تو آ گیا؟ کیا جنگ کے نقارے کی پہلی چوٹ سے تیری نیند ٹوٹ گئی؟

رستم: بہادر اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔ میں آدھی رات سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

سہراب: آج لڑائی کا دوسرا دن ہے جانتا ہے اس جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا؟

رستم: ہم دونوں میں سے ایک کی موت!

سہراب: شیر دل بوڑھے! میرا دل تیری موت دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایک غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔ اگر ایران کی گود بہادر فرزندوں سے خالی نہیں ہے تو جا واپس جا اور اپنے عوض کسی اور ایرانی دلیر کو بھیج دے۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ لوٹ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔

رستم: کل کی اتفاقی فتح پر غرور نہ کر۔ ہر نیا دن انسان کے لیے نئے انقلاب لے کر آتا ہے۔ تقدیر کا پہیہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا۔

گھڑی بھر میں بدلنا ہوگا تجھ کو پیرہن اپنا
منگا کر پاس رکھ لے جنگ سے پہلے کفن اپنا

(جنگ شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سہراب ہاتھ روک لیتا ہے)۔

سہراب: آج میں تجھ میں نیا جوش اور نئی قوت دیکھ رہا ہوں۔ جواں ہمت بوڑھے! مجھے پھر شک ہوتا ہے کہ تو رستم ہے۔ میں تیری عزت کا واسطہ اور تیری بہادری کی دہائی دے کر ایک بار پھر تیرا نام پوچھتا ہوں۔ زور سے نہیں، منت سے! غرور سے نہیں، عاجزی سے!

رستم: تو میرا نام ہی جاننا چاہتا ہے تو سن میرا نام ہے.............

سہراب: (خوشی کی گھبراہٹ سے) رستم!

رستم: نہیں! سہراب کی موت۔

سہراب: افسوس! تو نے میرے رحم کی قدر نہیں کی۔
(دوبارہ جنگ ہوتی ہے۔ رستم سہراب کو گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے)۔

رستم: بس اسی ہمت اسی طاقت پہ تھا اتنا غرور — تو کوئی شیشہ نہ تھا کیوں ہو گیا پھر چُور چُور
کیا ہوا زور جوانی اٹھ اجل ہے گھات — دیکھ لے اب کس قدر قوت ہے بوڑھے ہاتھ میں

(سہراب کے سینے میں خنجر جھونک دیتا ہے)۔

سہراب: آہ! اے آنکھو! تمہارے نصیب میں باپ کا دیدار نہ تھا کہاں ہو؟ پیارے باپ کہاں ہو؟ باپ کہاں ہو؟ آؤ آؤ کہ مرنے سے پہلے تمہارا سہراب تمھیں ایک بار دیکھ لے۔

کیا خبر تھی کہ بگڑ جائے گی قسمت اپنی
آخری وقت دکھا دو مجھے صورت اپنی

رستم: اپنی جوانی کی موت پر ماتم کرنے کے لیے باپ کو یاد کر رہا ہے؟ اب تیرے باپ کی محبت، اس کے آنسو، اس کی فریاد، کوئی تجھے دنیا میں زندہ نہیں رکھ سکتی۔

مرہم کہاں جو رکھ دے دلِ پاش پاش پر
آیا بھی وہ تو روئے گا بیٹے کی لاش پر

سہراب: بھاگ جا۔ بھاگ جا۔ اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں بھاگ جا۔ تو نے سام و نریمان کے خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے۔ تاریک جنگلوں میں پہاڑوں کے غار میں، سمندر کی تہہ میں، تو کہیں بھی جا کر چھپے لیکن میرے باپ رستم کے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔

رستم: (چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے) کیا کہا؟ کیا کہا؟ تو رستم کا بیٹا ہے؟

سہراب: ہاں۔

رستم: تیری ماں کا نام؟

سہراب: تہمینہ۔

رستم: تیرے اس دعوے کا ثبوت؟

سہراب: ثبوت اس بازو پر بندھی ہوئی میرے باپ رستم کی نشانی۔

رستم: جھوٹ ہے، غلط ہے، تو دھوکا دے رہا ہے۔ مجھے پاگل بنا کر اپنے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ (گھبراہٹ کے ساتھ سہراب کے بازو کا کپڑا پھاڑ کر اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھتا ہے) وہی مہرہ، وہی نشانی! (سر پٹک کر) کیا کیا؟ کیا کیا؟ اندھے پاگل جلاد! یہ کیا کیا؟ شیر جیسا خونخوار، بھیڑیے جیسا ظالم، ریچھ جیسا موذی حیوان بھی اپنی اولاد کی جان نہیں لیتا۔ لیکن تو انسان ہو کر حیوان سے بھی زیادہ خونی اور جہنم سے بھی زیادہ بے رحم ہے۔۔۔۔

ے
خون میں ڈوبا ہے وہ جس سے مزہ جینے میں تھا
دل کے بدلے کیا کوئی پتھر ترے سینے میں تھا
توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے او ظالم اسے
تیرا نقشہ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا

سہراب: فتح مند بوڑھے! تو رستم نہیں ہے پھر میری موت پر خوش ہونے کے بدلے اس طرح کیوں رنج کر رہا ہے؟

رستم: (رو کر) اس دنیا میں رنج، آنسو، رونے اور چھاتی پیٹنے کے سوا میرے لیے اب اور کیا باقی رہ گیا ہے۔ میں نے تیری زندگی تباہ کر کے اپنی زندگی کا ہر عیش اور اپنی دنیا کی ہر خوشی تباہ کر دی۔ مجھ سے نفرت کر! میرے منہ پر تھوک دے! مجھ پر ہزاروں زبانوں سے لعنت بھیج۔

ے
فغاں ہوں، حسرت و ماتم ہوں، سر سے پاؤں تک غم ہوں
میں ہی بیٹے کا قاتل ہوں، میں ہی بدبخت رستم ہوں

(سہراب کے پاس ہی زمین پر گر پڑتا ہے اور سہراب اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھاتی سے لپٹ جاتا ہے)۔

سہراب: بابا! میرے بابا!

رستم: ہائے میرے پیارے! تو نے الفت سے، نرمی سے، منت سے، کتنی مرتبہ میرا نام پوچھا، اس محبت و عاجزی کے ساتھ پوچھنے پر لوہے کے ٹکڑے میں بھی زبان پیدا ہو جاتی ہے، پتھر بھی جواب دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس دو روزہ دنیا کی جھوٹی شہرت اور اس فانی دنیا کے فانی غرور نے میرے ہونٹوں کو ہلنے کی اجازت نہ دی۔ میرے بچے! میری تہمینہ کی نشانی۔۔۔۔۔

ے کس جگہ بے رحم سینے میں یہاں رکھوں تجھے
آنکھ میں، دل میں، کلیجے میں، کہاں رکھوں تجھے

سہراب: ہومان، بارمان، ہجیر سب نے مجھے دھوکا دیا۔ بابا نہ رو! میری موت اللہ کی مرضی سمجھ کر صبر کر۔۔۔۔

ے مل گئی مجھ کو جو قسمت میں سزا لکھی تھی
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کی قضا لکھی تھی

رستم: جب تیری ناشاد ماں بال نوچتی، آنسو بہاتی، چھاتی پیٹتی، ماتم اور فریاد کی تصویر بنی ہوئی سامنے آ کر کھڑی ہوگی اور پوچھے گی کہ میرا لاڈلا سہراب، میرا بچہ، میری کوکھ سے پیدا ہونے والا شیر کہاں ہے؟ تو اپنا ذلیل منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لینے کے سوا اسے کیا جواب دوں گا؟ کن لفظوں سے اس کے ٹوٹے دل اور زخمی کلیجے کو تسلی دوں گا۔۔۔۔؟

ے سنوں گا ہائے کیسے مامتا کی اس دہائی کو
کہاں سے لاؤں گا مانگے گی جب اپنی کمائی کو
نگاہیں کس طرح اٹھیں گی مجھ قسمت کے ہیٹے کی
میں کس منہ سے دکھاؤں جانے ماں کو لاش بیٹے کی

سہراب: پیارے باپ! میری بدنصیب ماں سے کہنا کہ انسان سب سے لڑ سکتا ہے، قسمت سے جنگ نہیں کر سکتا۔ آہ! (رستم کی گود سے زمین پر گر کر آنکھیں بند کر لیتا ہے)۔

رستم: یہ کیا! یہ کیا! میرے بچے آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ کیا خفا ہو گئے؟ کیا ظالم باپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے؟ یہ موت کا گہوارہ، یہ خون میں ڈوبی ہوئی زمین، پھولوں کا بستر، ماں کی گود، باپ کی چھاتی نہیں ہے۔ پھر تمھیں کس طرح نیند آ گئی۔۔۔۔

سہراب: ماں۔۔۔۔۔اللہ۔۔۔۔۔تمھیں۔۔۔۔۔۔تسلی دے!

رستم: اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔بیٹا بولو۔۔۔۔۔۔بولو، چپ کیوں ہو گئے۔ آہ! آہ! اس کا خون سرد ہو رہا ہے۔ اس کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں۔ اے اللہ! اے کریم و رحیم اللہ! اولاد باپ کی زندگانی کا سرمایہ اور ماں کی روح کی دولت ہے۔ یہ دولت محتاجوں سے نہ چھین، اپنی دنیا کا قانون بدل ڈال، اس کی موت مجھے اور میری باقی

زندگی اسے بخش دے۔ موت! موت تو زال و رودابہ کے گھر کا اجالا اور میرے بڑھاپے کی امید، میری تہمینہ کا بولتا کھیلتا ہوا کھلونا کہاں لے جا رہی ہے؟ دیکھ، میری طرف دیکھ! میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو تاج و تخت کی بھیک دی ہے۔ آج ایک فقیر کی طرح تجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔۔۔۔

ڈال دے جھولی میں تو میرے گلِ شاداب کو
ہاتھ پھیلائے ہوں میں دے دے مرے سہراب کو

سہراب: (آنکھیں بند کیے ہوئے) دنیا۔۔۔ رخصت۔۔۔۔ اللہ! (مر جاتا ہے)۔

رستم: آہ! جوانی کا چراغ آخری ہچکی لے کر بجھ گیا۔ بے رحم موت نے میری امید کی روشنی لوٹ لی۔ اب لاکھوں چاند، ہزاروں سورج مل کر بھی میرے غم کا اندھیرا دور نہیں کر سکتے۔ آسمان، ماتم کر! زمین، چھاتی پیٹ! درخت، پہاڑو، ستارو، ٹکرا کر چور چور ہو جاؤ! آج ہی زندگی کی قیامت ہے۔ آج ہی دنیا کا آخری دن ہے۔ زندگی! دنیا! کہاں ہے زندگی؟ کہاں ہے دنیا؟ زندگی سہراب کے خون میں اور دنیا رستم کے آنسوؤں میں ڈوب گئی (دیوانوں کی طرح پکارتا ہے) سہراب۔۔۔۔۔۔ سہراب۔۔۔۔۔۔ سہراب۔۔۔۔۔۔ (غش کھا کر گر پڑتا ہے)۔

(پردہ گرتا ہے)

(رستم و سہراب)

مشق

ا) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) رستم اُداس چہرے اور غمگین دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے کیوں التجا کر رہا تھا؟

ب) رستم کے للکارنے پر سہراب کیا جواب دیتا ہے؟

ج) ''تقدیر کا پہیہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا''، رستم کے اس جملے کا مطلب کیا تھا؟

د) دوسرے دن کی جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

ہ) رستم کو کس طرح معلوم ہوا کہ یہ اس کا بیٹا سہراب ہے؟

د) سہراب کے مرنے کے بعد رستم کی حالت اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

ز) جب سہراب زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا تو رستم کیا دعا مانگ رہا تھا؟

ح) سہراب کو کس طرح شک ہوا کہ اُس کا مدمقابل رستم ہی ہے؟

۲) سہراب کے کردار کے حوالے سے اس کے چند اوصاف لکھیں۔

۳) رستم اور سہراب کے کرداروں کا ایک دوسرے سے موازنہ کریں۔

۴) آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے رُستم اور سہراب سے کتاب میں شامل سین کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۵) اگر آپ رستم کی جگہ ہوتے تو سہراب کے نام پوچھنے پر کیا جواب دیتے؟

ڈرامہ

ڈرامہ یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی عمل کر کے دکھانا۔ ڈرامے کی ابتداء بھی یونان سے ہوئی۔ برصغیر میں بھی قدیم زمانوں سے ڈرامے کا سراغ ملتا ہے۔ راجہ بکرماجیت کے عہد کا لکھا ہوا ڈرامہ ''شکنتلا'' دنیا بھر میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ قدیم زمانے میں لوگ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ڈرامہ کھیلا کرتے تھے۔ مگر بعد میں یہ ترقی کر کے فن کی منزل تک پہنچ گیا۔ ڈرامے کی دو مشہور اقسام ہیں۔

۱۔ طربیہ ڈرامہ: وہ ڈرامہ جس میں ہنسی اور مزاح کے ذریعے سماج کی کمزوریوں سے پردہ اٹھایا جائے۔

۲۔ المیہ ڈرامہ: وہ ڈرامہ جس میں پیش آنے والے واقعات اندوہناک ہوں اور اس کا انجام المیہ ہو۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی

۱۔ پلاٹ: کہانی کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ مختصر، دلچسپ اور جاذب ہونا چاہئے۔ ڈرامہ نگار کو چاہئے کہ وہ پلاٹ سے غیر ضروری چیزوں کو خارج کر دے اور مواد کو مضبوط اور مربوط انداز میں پیش کرے۔

۲۔ کردار نگاری: ڈرامے کا تعلق چونکہ فعل اور عمل سے ہے۔ اس لیے اس میں کردار نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کرداروں کی گفتگو اور حرکات و سکنات ہی ڈرامے کو کامیاب بناتی ہیں۔ لہٰذا کرداروں کی گفتگو موقع محل کے مطابق ہونی چاہئے۔

۳۔ ارتقائی عمل: اس منزل میں ابتدائی منازل سے گزر کر پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ کہانی کئی پیچیدگیوں سے گزرتی ہے اور مختلف مسائل ابھرتے ہیں۔ ڈراما نگار کو چاہئے کہ وہ ارتقائی عمل کے دوران میں مناسب اختصار کے ساتھ واقعات کو آگے بڑھائے۔

۴۔ کشمکش: تصادم یا کشمکش ڈرامے کے پلاٹ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔تصادم ہی سے حق و باطل کا مسئلہ اٹھتا ہے اور اسی بنیاد پر کہانی کا ایک کردار ہیرو اور دوسرا ولن بن جاتا ہے۔کبھی یہ تصادم افراد میں ہوتا ہے۔لہٰذا یہ کشمکش گزشتہ واقعات کے نتیجے میں بڑے فطری انداز میں ظاہر ہونی چاہیے۔

۵۔ مکالمہ نویسی: مکالمے کو ڈرامے میں بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی بناء پر ہم کرداروں کو سمجھ سکتے ہیں۔،خود کلامی ہی ڈرامے کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

۶۔ اسٹیج: ڈرامے میں سب سے ضروری چیز اسٹیج ہے۔اس کے بغیر ڈرامہ بے جان جسم کی حیثیت رکھتا ہے۔اسٹیج پر مختلف کردار نمودار ہوتے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات اور بول چال سے ہم کردار کا نقشہ اپنے ذہنوں میں بٹھاتے ہیں۔

۷۔ اختتامی عمل: ڈرامے کی اس منزل میں کرداروں کا باہمی تصادم ختم ہو جاتا ہے۔اور اس میں کہانی کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتی ہے۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی ادب پارے کا مرکزی خیال/ اہم نکات نتائج، کردار، واقعات کی تشریح، امتحانی انداز میں لکھوائیں۔
۲) طلبہ سے گروپ کی صورت میں ڈرامے لکھوائے جائیں۔
۳) اساتذہ کرام طلبہ کو چند دیگر ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں کے کچھ حصے سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) طلبہ کو انسانی رویوں سے آگاہ کریں۔
۲) طلبہ کو اُردو زبان میں ڈرامہ نگاری کی روایت مختصراً بتادیں۔
۳) طلبہ کو ڈرامہ نگاری میں آغا حشر کاشمیری کے مقام سے آگاہ کریں۔
۴) طلبہ کو آغا حشر کاشمیری کے مکالموں کی اہمیت اور اسلوب بتادیں۔

خواجہ معین الدین

(حالاتِ زندگی)

خواجہ معین الدین ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حیدر آباد ہی سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ تعلیمی سلسلہ منقطع رہا مگر مابعد ایف۔اے اور بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ دورانِ تعلیم ہی آزادی کی تحریک سے وابستہ رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ وقتاً فوقتاً حیدر آباد دکن کے اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے۔ مگر مستقل طور پر کسی جریدے میں ملازمت اختیار نہیں کی۔ کسی بھی اخبار یا رسالے میں چند ماہ سے زیادہ کام نہیں کیا۔ اسی دوران وہ مختلف تھیٹر کمپنیوں کے لیے ڈرامے بھی لکھتے رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور ایک سکول میں مدرس بن گئے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں انھوں نے پاکستانی تھیٹر کے لیے لازوال ڈرامے تحریر کیے جو آج تک ٹیلی وژن، ریڈیو اور مختلف شہروں کے اسٹیج پر پیش ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے کراچی میں ''ڈراما گلڈ'' کے بینر تلے ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کے بانی صدر وہ خود اور سیکرٹری آغا ناصر تھے۔ جہاں اِن ہی کے ڈرامے اسٹیج کیے گئے جو عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔

اُن کے ڈراموں میں آج بھی وہی تازگی اور کشش باقی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ڈرامے ایسے موضوعات پر مشتمل ہیں جو قومی اور سیاسی نوعیت کے ہیں۔ ہر ڈرامے کا کوئی نہ کوئی مقصد اور پیغام ہے۔ ان کا ڈرامہ ''زوال حیدر آباد'' ہندوستان کی ایک بڑی مسلم ریاست پر بھارتی سامراج کے ظلم و تشدد کی کہانی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں ''لال قلعے سے لالوکھیت تک'' سٹیج کیا۔ یہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے لاکھوں مہاجرین اور پاکستان کے بالکل ابتدائی زمانے کی صورتحال کا تجزیہ ہے۔

اس کے علاوہ مسئلہ کشمیر پر ایک ڈراما ''نیا نشان'' لکھا اور پیش کیا۔ چونکہ اس میں اپنے ملک کے سیاستدانوں پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ اس لیے حکومت نے اس کی نمائش پر پابندی لگا دی۔ بعد میں اس ڈرامے میں مناسب ترمیم کر کے ''وادی کشمیر'' کے نئے نام سے پیش کیا گیا۔ ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' پاکستان کے اس وقت کے دارالحکومت کراچی کی معاشرتی زندگی کا عکس ہے جبکہ ان کا مشہور ڈرامہ ''تعلیمِ بالغاں'' قومی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا مرقع ہے۔ آپ نے صرف سنتالیس سال کی عمر میں ۱۹۷۱ء کو کراچی میں وفات پائی۔

مرزا غالب بندر روڈ پر (ایک کھیل)

(خواجہ معین الدین)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو خواجہ معین الدین کے مکالموں کی پہچان کروانا۔
- طلبہ کو مکالمے کی زبان میں حقیقت کا ادراک کروانا۔
- طلبہ کو خواجہ معین الدین کے مقام سے آگاہی دینا۔

الفاظ و تراکیب

بازیچہ اطفال	نیم ہویدا	شہرِ خموشاں	قندیل	رکھوالی
سوانگ	بھاڑ میں جھونکنا	ملیامیٹ	بساط الٹنا	ناٹک

☆

کردار:

ا۔ حوالدار: ہندوستانی پولیس کا ایک فرد
۲۔ فقیر: دہلی کے ایک قبرستان کا رکھوالا
۳۔ ٹیپو: ایک امیر گھرانے کا بگڑا ہوا نوجوان

پس منظر سے آواز

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

آہستہ آہستہ اسٹیج کا پردہ اٹھتا ہے اور منظر سامنے آتا ہے۔ یہ دہلی کا ایک قبرستان ہے جس میں مرزا غالب کا مقبرہ زیرِ تعمیر ہے۔ رات کا وقت ہے۔ نیلے آسمان کی چمک سے قبرستان کا منظر نیم ہویدا ہے۔ جھینگروں کی آواز سے شہر خموشاں کا سکوت اور بھی معنی خیز ہو گیا ہے۔ قبرستان کی عقبی دیوار کے ایک شکستہ حصہ سے روشنی نمودار ہوتی ہے۔ یہ روشنی جوں جوں قبرستان کے احاطے میں آگے بڑھتی جاتی ہے قبرستان کا منظر بھی نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ یہ روشنی آنے والے ایک ضعیف العمر شخص کی قندیل سے پیدا ہے۔

آنے والا بوڑھا فقیر جس کے جسم پر ایک مَیلا کچیلا لمبا کُرتا ہے اور لنگی باندھے ہوئے ہے۔ اپنے ایک ہاتھ میں قندیل اور ایک میں عصا تھامے اور ایک تھیلی کندھے سے لٹکائے، وہ قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنی جھونپڑی کی طرف آرہا ہے، جو ایک کنارے بنی ہے۔ اس کے سر پر اور داڑھی کے بال ژولیدہ ہیں۔ جھونپڑی کے قریب ہی ایک ٹوٹے ہوئے اسٹول پر حولدار اپنی لاٹھی کے سہارے سو رہا ہے۔

فقیر: (قبرستان کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے) اللہ ہی اللہ ہے...... رہے نام اللہ کا (قندیل کی روشنی میں حوالدار کو دیکھ کر) اوہ۔ حوالدار بابو تم آج بھی آ گئے؟ (غور سے حوالدار کے چہرے کو دیکھ کر) ہاہاہاہا...... جسم پر ڈریس بھی ہے، ہاتھ میں ڈنڈا بھی ہے۔ پہرہ بھی دے رہے ہیں۔ مگر ذرا آنکھ لگ گئی ہے۔ کیا حکومت چل رہی ہے۔ صاحب۔ واہ۔ واہ۔ واہ...... حوالدار بابو۔ حوالدار بابو (حوالدار بابو ایک دم چونک کر سلوٹ کرتا ہے)

فقیر: (ڈر کر تھیلی ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے) ہائیں۔ یہ کیا۔ اس طرح سلام کر کے مجھے کیوں گنہگار کرتے ہو بابو......

حوالدار: (جماہی لیتے ہوئے اور آنکھیں مَلتے ہوئے) آں تم کون؟

فقیر: میں اِن قبروں کا رکھوالا ہوں بابو۔

حوالدار: رکھوالا؟

فقیر: ہاں بابو! زندگی میں تم ہماری رکھوالی کرتے ہو اور مرنے کے بعد ہم تمہاری رکھوالی کرتے ہیں۔

حوالدار: اوہ۔ تم ہو، میں سمجھا، میرا انسپکٹر آ گیا ہے۔ (جماہی لیتے ہوئے) معاف کرنا بھائی بہت تھک گیا ہوں۔

فقیر: یہ حکومت کے کام ہی بڑے تھکا دینے والے ہوتے ہیں بابو۔ جو بھی حکومت میں جاتا ہے تھک کر سو ہی جاتا ہے۔ روٹی ووٹی کھائی یا نہیں؟

حوالدار: روٹی!

فقیر: ہاں بابو! اگر ذات پات، امیری یا غریبی کا خیال نہ کرو، تو اس فقیر کے ساتھ دو لقمے کھالو۔

حوالدار: کیوں؟ آج کوئی اچھی چیز مانگ لائے ہو کیا؟

فقیر: اچھی چیز اب کہاں بابو...... دکاندار کہتے ہیں، جب سے ہندوستان کو آزادی ملی ہے۔ اچھی چیز تو فقیر سے پہلے پولیس والے ہی مانگ لے جاتے ہیں۔

حوالدار: اچھا، تو تم پولیس والوں کو بھکاری سمجھتے ہو؟

فقیر: نہیں نہیں، بابو ہرگز نہیں۔ میرے منہ میں خاک۔ میں ایسی بات کہہ سکتا ہوں۔ میں اصل میں...... اصل میں یہ پوچھنا......

حوالدار: ہاں، ہاں پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو...... ڈرتے کیوں ہو۔

فقیر: ڈرتا تو نہیں بابو...... (رُک کر) ہر ایک سے ڈر ضرور ہوتا ہے۔

حوالدار: (قہقہہ لگا کر) ہاہاہا۔ یہ بھی خوب رہی۔

فقیر: بابو اگر تم ہندو ہو تو بازار سے کچھ دُودھ وُودھ لاؤں...... پینے کے لئے۔

حوالدار: نہیں بھائی...... میں تو مسلمان ہوں۔

فقیر: کیوں مذاق کرتے ہو بابو۔ اب ہندوستانی پولیس میں مسلمان کہاں ہوتے ہیں اور وہ بھی حوالدار......؟

حوالدار: اسے میری خوش نصیبی سمجھو یا بدنصیبی کہ میں مسلمان بھی ہوں اور حوالدار بھی......

فقیر: تم کہتے ہو تو یقین کرنا ہی پڑے گا بابو......

حوالدار: ورنہ جی نہیں مانتا...... ہاں۔

فقیر: یہ بات نہیں ہے بابو...... نہ جانے کیسا زمانہ آگیا ہے۔ ٹیپو سچ کہتا تھا۔ آج ایک مسلمان دوسرے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔

حوالدار: یہ تمہارا ٹیپو بھی خوب آدمی ہے...... کون ہے یہ......؟

فقیر: اپنی اسی دِلّی کے ایک امیر گھرانے کا لڑکا ہے، بابو۔ بہت پڑھا لکھا ہے۔ شاعر بھی ہے۔

حوالدار: اچھا............!!؟

فقیر: مگر اب کیا...... اب تو ایک ...... پاگل اور دیوانہ ہے۔ ایک تھیٹر کمپنی میں کام کرتا ہے۔ ہر وقت ایک نئے سوانگ میں آتا ہے۔

حوالدار: آدمی دلچسپ ہے......!

فقیر: ہاہاہا...... کل رات مجھ سے کہہ رہا تھا، دادا میرا تماشا دیکھنے چل۔ آج کل میں ٹیپو سلطان کا پارٹ کر رہا ہوں...... ہاہاہا......

حوالدار: ہاہاہا...... خوب! پاگل کہیں کا!!

فقیر: بالکل پاگل ہے۔ چھوٹے بچوں کی سی حرکتیں کرتا ہے...... لو!...... یہ کھاؤ...... یہ اچھی چیز ہے۔
(دونوں کھانا شروع کرتے ہیں...... خاموشی)

فقیر: بابو!

حوالدار: ہاں!

فقیر: تم اِس قبرستان میں پہرہ دے رہے ہو بابو؟

حوالدار: تو کیا میرے مسلمان ہونے کا یقین آگیا......؟

وہ تو میں تمہاری باتوں ہی سے سمجھ گیا تھا بابو......آج ساٹھ برس سے دِلّی کی گلیوں میں بھیک مانگ رہا ہوں۔

فقیر: کوئی بھاڑ نہیں جھونکی ہے۔ مسلمان کے سوا ایسی اچھی اُردو اور کون بول سکتا ہے۔

حوالدار: بھائی تم خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو......کیا تمہارے قبرستان میں اس سے پہلے کوئی پولیس والا نہیں آیا؟

فقیر: مگر وہ تو مردہ تھے بابو......

حوالدار: اوہ! اور میں زندہ ہوں!! اس لئے گھبرا رہے ہو؟ لوگ مُردوں سے ڈرتے ہیں اور تم زندوں سے ڈرتے ہو؟

فقیر: مُردے زندہ کا سوال نہیں بابو، بات اصل میں یہ ہے کہ رگھّو موچی ہے نا رگھّو موچی...... یہ جو پرلی طرف فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے۔ سُنا ہے حکومت کا آدمی ہے۔

حوالدار: حکومت کا آدمی......؟

فقیر: ہاں بابو...... سارے دکاندار یہی کہتے ہیں۔ کل مجھ سے کہنے لگا......"پیرن تو جانتا ہے۔ تیرے قبرستان پر حکومت نے پہرہ لگا دیا ہے...... ہندو مہا سبھا والے اس قبرستان کو توڑ کر یہاں گئوشالہ بنانا چاہتے ہیں"۔

حوالدار: جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ جو مرزا غالب کا مقبرہ بن رہا ہے نا، آج تین راتوں سے میری ڈیوٹی اس طرف لگائی گئی ہے۔ رات زیادہ ہو جاتی ہے۔ دور دور تک کہیں کوئی بیٹھنے کی جگہ نظر نہیں آتی۔ یہاں تمہاری جھونپڑی میں چراغ دیکھتا ہوں تو ادھر چلا آتا ہوں......

فقیر: جب تک تمہارا جی چاہے بیٹھو...... اب میرے دل کو سکون ہوا۔ ورنہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں لوگ اس قبرستان کو ملیامیٹ نہ کرنا چاہتے ہوں۔

حوالدار: کیسی باتیں کرتے ہو بابا...... قبرستان کو کون ملیامیٹ کرے گا؟

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں اور ٹیپو...... داخل ہوتا ہے)

ٹیپو: ابے...... تو ڈرتا کیوں ہے...... ملیامیٹ کرتے ہیں، تو کرنے دے مگر کان کھول کر سُن لے...... ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں کوئی ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ملیامیٹ کر لیتے ہیں۔ یہ دیکھ، میں نے آج پوری دو باٹل کوک پی کر اپنے آپ کو ملیامیٹ کر لیا ہے۔ یہ لے تیرے لئے بھی لیتا آیا ہوں......

(پولیس والے کو دیکھ کر گھبراتے ہوئے) پولیس...... دادا میں تو چلا۔

(حوالدار ٹیپو کو بھاگتا دیکھ کر زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

فقیر: ٹیپو!

ٹیپو: ہُش۔ دادا یہ آواز سُن رہا ہے تو......

فقیر: کونسی؟

ٹیپو: یہی جو ابھی آرہی تھی۔

فقیر: کونسی آواز......؟

ٹیپو: تُو اِدھر آ (کان میں) یہ کسی کے ہنسنے کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

فقیر: اماں وہ تو حوالدار بابو ہنس رہے تھے۔

ٹیپو: وہی تو کہہ رہا ہوں کہ جب حوالدار ہنستا ہے اور کُتّے روتے ہیں تو دنیا پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آتی ہے۔

فقیر: (گھبرا کر) حوالدار بابو۔ اس کی باتوں کا بُرا نہ ماننا۔

حوالدار: کیوں بے، کیا ہورہا ہے یہ......

ٹیپو: ادب سے بات کر، او نا ہنجار سپاہی...... جانتا نہیں، مابدولت کا نام ٹیپو ہے۔

حوالدار: ہاہاہا......شرم نہیں آتی تجھے اپنے آپ کو ٹیپو کہتے ہوئے۔

ٹیپو: اور شرم نہیں آتی تجھے، ٹیپو کو اِس پھٹے حال میں دیکھ کر بھی، اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے...... کمبخت...... جب میں میسور کا بادشاہ تھا اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتا تھا، اُس وقت بھی تو نے چند ٹکوں کے عوض ایسا ہی لباس پہن کر میرے سینے پر گولی چلائی تھی...... یہ دیکھ...... یہ ٹیپو کا سینہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کا سینہ ہے۔ آہ! اس سینے میں اپنے ہی بھائی کی غداری کا خنجر چُبھا ہوا ہے...... غدار...... یہ لباس اُتار...... بڑا حوالدار کی دُم بنا پھرتا ہے۔

فقیر: (غصہ سے ٹیپو کی طرف دیکھتے ہوئے) ٹیپو! (حوالدار سے مخاطب ہوکر) اس کی باتوں کا بُرا نہ ماننا بابو...... اِس کمبخت نے ایک ناٹک کمپنی میں نوکری کر لی ہے، اور اس قسم کی ناٹکی زبان بولتا ہے۔

ٹیپو: اُس قوم پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے...... جو اپنی تاریخ کو بھی ناٹک اور کھیل تماشا سمجھتی ہے۔

فقیر: ٹیپو! یہ ناٹک کمپنی نہیں ہے، سمجھا۔ یہ قبرستان ہے قبرستان......؟

ٹیپو: قبرستان؟ ہا ہا ہا۔ یہ قبرستان نہیں، ہے دادا۔ یہ اکبر کا، جہانگیر کا، شاہجہان اور عالمگیر کا حسین اور خوبصورت ہندوستان ہے۔ ذرا اس قبرستان کی بساط تو الٹ کر دیکھ...... یہ مُردے نہیں ہیں۔ زندگی کے معنی تو یہی جانتے تھے۔ انہوں نے سارا ہندوستان ہمارے حوالے کر کے اپنے آپ کو دو گز زمین میں چھپا لیا ہے...... مُردے تو

ہم ہیں دادا، جو ہندوستان تو ہندوستان ان کی قبروں کی حفاظت کے بھی قابل نہیں رہے...... کون جانتا ہے دادا...... اِن قبروں کے اُس طرف بیٹھے ہوئے ہم اُن کو مردہ سمجھ رہے ہوں...... یہ دنیا سمجھ میں آنے والی جگہ نہیں ہے...... دادا...... (فقیر کی طرف ایک پُڑیا پھینکتا ہے)

فقیر: ارے کمبخت یہ تو مٹھائی ہے۔

ٹیپو: مٹھائی ہے تو مٹھائی کھاؤ۔

فقیر: یہ مٹھائی کس نے دی ہے رے تجھے......

ٹیپو: اس اونچی قبر کے بیٹے نے۔

حوالدار: اونچی قبر کا بیٹا؟

فقیر: کیا اسلم میاں فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔ توبہ توبہ، یہ تو بالکل ہی بھول گیا کہ آج وہ آنے والے تھے۔ اماں تُو نے ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی......؟

ٹیپو: کس کو یاد ہے؟

فقیر: تُو نے اُن کو سلام کیا تھا؟

ٹیپو: ہاں۔ اُنہوں نے مجھے خدا حافظ کہا تھا۔

فقیر: اللہ حافظ؟ کیا کہہ رہا ہے تو؟

ٹیپو: ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ وہ پاکستان جارہے ہیں۔ اس لئے آخری بار اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے تھے...... بے وقوف...... جیسے ہندوستان اب کوئی ملک نہیں رہا...... بلکہ فاتحہ پڑھنے کی جگہ ہوگیا ہے۔

فقیر: تو گویا اسلم میاں بھی اپنے باپ دادا کی قبروں کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

حوالدار: لوگ تو بڑے بڑے محل چھوڑ کر گئے ہیں، بابا۔ ان قبروں کی کیا اہمیت ہے۔

ٹیپو: ہاہاہا۔ قبروں کی اہمیت کو تو کیا جانے حوالدار...... تیرا کام تو محلوں کی رکھوالی کرنا ہے...... قبروں کی اہمیت مسلمانوں کی تاریخ سے پوچھ...... اس زمین و آسمان نے...... آج تک...... تاج محل سے زیادہ حسین کوئی اور محل نہیں دیکھا...... مسلمان جب زندہ تھے تو قبروں کا احترام بھی کرتے تھے۔ اب تو چلتی پھرتی لاشیں باقی رہ گئی ہیں۔ ہمیں یہ قبرستان بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں (ہچکی لے کر) اللہ مجھے معاف کرے...... میں کیسی باتیں کررہا ہوں۔

حوالدار: (طنز سے) اللہ ضرور معاف کرے گا تجھے...... قبرستان میں...... بیٹھ کر کیسی باتیں کر رہا ہوں۔

ٹیپو: ہاں ضرور معاف کرے گا...... کمبخت تو اللہ کو بھی کوئی حوالدار سمجھتا ہے۔

فقیر: ٹیپو...... زبان کو قابو میں رکھ۔ اگر ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو جا یہاں سے نکل جا......

ٹیپو: ارے تو غصہ کیوں کرتا ہے، دادا۔ یہ قبرستان کوئی تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ ظالم یہی تو ایک چیز ہے۔ جس میں ہم غریب بھی امیروں کے برابر حصہ پاتے ہیں...... دو گز زمین، دو گز کفن۔ یہی اس زندگی کا انجام ہے دادا۔

فقیر: ٹیپو اللہ کے واسطے اب تو خاموش رہ بیٹے۔ تو ہندوستان میں رہ کر پاکستان کی باتیں کیوں کرتا ہے؟

ٹیپو: میں کیا کروں دادا...... میرے بزرگوں نے بچپن ہی سے مجھے یہ تعلیم دی ہے کہ ہندوستان میں رہ کر بھی دن میں پانچ دفعہ...... عرب کے ریگستانوں کی طرف دیکھ لیا کرو...... مجھے ان ریگستانوں کی طرف دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے، دادا......

(مرزا غالب بندر روڈ پر)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) فقیر نے حوالدار کے چہرے کو کیوں غور سے دیکھا؟

ب) قبرستان پر حکومت نے پہرہ کیوں لگایا؟

ج) حوالدار کی شخصیت پر پانچ جملے تحریر کریں۔

د) کتوں کا بھونکنا کس بات کی علامت سمجھی جاتی ہے؟

ہ) ٹیپو کی باتوں سے حوالدار نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟

و) ٹیپو کا تعلق کس گھرانے سے تھا؟

۲۔ سبق کے متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) مرزا غالب کا مقبرہ ہے:

(i) دہلی میں (ii) لاہور میں

(iii) آگرہ میں (iv) کلکتہ میں

ب) ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' صنف ادب کے لحاظ سے ہے:

(i) افسانہ (ii) ناول

(iii) ڈرامہ (iv) داستان

ج) قبرستان کے احاطے میں روشنی پیدا ہوئی:

(i) سورج نکلنے سے (ii) بلب سے

(iii) قندیل سے (iv) موم بتی سے

(د) فقیر کے سر اور داڑھی کے بال ہیں:

(i) سفید (ii) سیاہ

(iii) ژولیدہ (iv) میلے کچیلے

ہ) حوالدار کے ہاتھ میں ہے:

(i) رائفل (ii) ڈنڈا

(iii) کلاشنکوف (iv) پستول

۳۔ متن کے مطابق درست جواب کی نشاندہی (✓) اور غلط کی (✗) سے کریں۔

الف) فقیر غور سے ٹیپو کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

ب) فقیر خود کو قبروں کا رکھوالا سمجھتا تھا۔

ج) ٹیپو ایک تھیٹر کمپنی میں کام کرتا ہے۔

د) حوالدار ٹیپو کو بھاگتا دیکھ کر زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔

ہ) ڈرامے کا ٹیپو میسور کا بادشاہ تھا۔

۴۔ ڈرامہ ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' کے مختلف کرداروں پر مختصر روشنی ڈالیں۔

۵۔ ڈرامہ ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۶۔ ڈرامہ ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' میں کس طرح کی منظر کشی کی گئی ہے؟

۷۔ ڈرامہ ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' کی روشنی میں خواجہ معین الدین کے طرزِ تحریر پر ایک جامع نوٹ تحریر کریں۔

انشائیہ

انشائیہ ایک شخصی، مختصر اور بے ساختہ صنف نثر ہے جس میں مصنف کی ذات سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے اور وہ مضمون کی طوالت و سنجیدگی سے ہٹ کر کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار سادہ الفاظ میں کر کے براہِ راست اپنا تعارف کراتا ہے۔ انشائیہ نگار کو زبان پر عبور حاصل ہونا چاہئے۔ ورنہ زبان کی شُستگی انشائیے کے لطف کو زائل کر دے گی۔

تبصرہ

کسی کتاب کے موضوع کے نمایاں خدوخال سے قاری کو متعارف کرائے بغیر اس کی کسی نزاعی بحث میں پڑا جائے تبصرہ کہلاتا ہے۔ تبصرہ نگاری بالکل جدید صنف ادب ہے۔ اس کا رواج بھی اُردو میں انگریزی کے زیرِ اثر ہوا ہے۔ تبصرہ نگاری تنقید سے مختلف ہے۔ تنقید میں ایک نقاد اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے مگر تبصرہ میں ہر قسم کے تعصبات اور میلانات سے بالاتر بات کی جاتی ہے اور کتاب کے موضوع ہی کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

خاکہ

کسی شخص کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کرنا کہ اس کا تعارف بھی ہو جائے اور وہ اس کی سوانح بھی نہ ہو مگر اس کے افکار و کردار پر روشنی پڑے اور خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی خامیاں اور خوبیاں قاری پر ظاہر ہو جائیں۔ ایک خاکے میں کسی شخص کی زندگی کے بعض گوشوں کا بیان اس انداز میں ہوتا ہے کہ خاکہ نگار اس کی سوانح تو نہیں لکھتا۔ مگر چند سوانحی حالات واضح ہو جاتے ہیں۔ نثر میں خیال آرائی اور تخیل سے کام لیا جا سکتا ہے اور لطیف مزاح کا سہارا لے کر اس شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کوئی مضمون لکھواتے ہوئے ان سے علمی حاصلات اور نکات پر ان کی رائے لیں۔
۲۔ خواجہ معین الدین کے دیگر ڈراموں "تعلیم بالغاں" اور "لال قلعہ سے لالوکھیت تک" کے چند مکالمے سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو ڈراموں میں مکالمے کی اہمیت پر لیکچر دیں۔
۲۔ طلبہ کو ڈرامہ نگاری میں خواجہ معین الدین کے مقام سے آگاہ کریں۔

ابنِ انشاء

(حالاتِ زندگی)

ابنِ انشاء کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ آپ ۱۹۲۷ء میں جالندھر کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی۔ پھر ۱۹۴۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ روزنامہ جنگ کراچی، روزنامہ امروز لاہور اور اخبار جہاں کراچی کے لیے کالم لکھتے رہے۔

ان کے دو شعری مجموعے "چاند نگر" اور "اس بستی کے کوچے" شائع ہوئے چینی نظموں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ یونیسکو کے مشیر کی حیثیت سے متعدد یورپی اور ایشیائی ممالک کا دورہ کیا۔ جن کا احوال اپنے "سفرناموں چلتے ہو تو چین کو چلیئے"، "آوارہ گرد کی ڈائری"، "دنیا گول ہے" اور "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" اپنے مخصوص مزاحیہ۔ طنزیہ اور فکاہیہ انداز میں تحریر کیا ہے۔

ابنِ انشاء اُردو ادب میں تین حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایک شاعر، دوسرے مزاح نگار اور تیسرے سفرنامہ نگار، شاعر کی حیثیت سے اُن کا بلند مقام ہے۔ انھوں نے نہایت خوبصورت غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ اُن کی اکثر غزلیں ٹی۔وی پر ٹیلی کاسٹ ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً اُن کی ایک غزل کا مطلع ہے:

~ انشاء جی اُٹھو اب کوچ کرو   اس شہر میں دل کا لگانا کیا

اسی طرح اُن کی غزل کا مطلع ہے:

~ کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا   کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا

اسی طرح انھوں نے مختلف اخبارات و رسائل میں مزاحیہ کالم لکھ کر اُردو مزاح نگاری میں بلند مقام حاصل کیا۔ وہ حالات و واقعات کے بیان سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی وجہ شہرت سفرنامے اور طنز و مزاح ہے۔

سفرنگاری میں ابنِ انشاء نے نئی طرح ڈالی ہے واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات اور احساسات کو بھی بیان کیا ہے اور ساتھ ہی غیر ملکی عمارات، چیزوں اور انسانوں کا اپنے ملک کی عمارتوں، چیزوں اور انسانوں سے بھی موازنہ کیا ہے۔ انھوں نے بعض مقامات پر غیر ملکیوں کی مہمان نوازی اور خاطر مدارت کا بڑھ چڑھ کر تذکرہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے ۱۲ جنوری ۱۹۷۸ء کو لندن میں وفات پائی۔

چلتے ہو تو چین کو چلیئے

(ابنِ انشاء)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو صنف سفرنامہ نگاری سے واقفیت دلانا۔
- دوست ملک چین کے بارے میں طلبہ کو معلومات دینا۔
- دیوارِ چین کی تاریخی اہمیت واضح کرنا۔
- طلبہ کو ابنِ انشاء کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔

الفاظ و تراکیب

مربوط	ہجوم	تخت و تاراج	وحشت	جواہر
مشروب	نعلین در بغلین	رپٹ رپٹ	گداز	صغرٰی

اپریل کے مہینے کی چوبیسویں تھی اور اتوار کا روز کہ ہم علی الصبح دیوارِ چین کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ یہ پیکنگ سے کوئی پچیس تیس میل کی دوری پر ہے اور چین کا لاکھوں مربع میل علاقہ اس کے شمال میں پھیلا ہے۔ اب سے بائیس تئیس سو برس پہلے جب یہ بنی تھی تو اس کا مقصد شمال سے تاتاریوں کے حملے کو روکنا تھا۔ تحقیق کہتی ہے کہ جہاں تہاں دیواریں تو مختلف حکمرانوں نے پہلے ہی کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہاں شہنشاہ اوّل چن شہ ہوانگ تی نے ۲۱۴ ق م میں ان کو مربوط کیا۔ ان پر برج بنائے اور دھوئیں کے سگنل دینے کا طریقہ رائج کیا جو اس کے پایۂ تخت سیان سے نظر آسکیں، چین والے اپنی زبان میں اس کو ۳۰ ہزار میل لمبی دیوار کہتے ہیں، لیکن فی الحقیقت یہ ڈیڑھ ہزار میل کے لگ بھگ ہے۔ کہیں یہ پندرہ فٹ اونچی ہے، کہیں پچاس فٹ۔ کچھ حصہ بڑی بڑی اینٹوں سے بنا ہے، کچھ پتھروں سے۔ دیوار کے زیادہ تر حصے کے ساتھ ایک بیرونی خندق بھی کھدی دکھائی دے گی۔ یہ ڈیڑھ ہزار میل کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا ہے۔ کہیں سے ریل دوڑتی گذرتی گئی ہے، کہیں سڑک بن گئی ہے۔ کہیں امتدادِ زمانہ نے شکست و ریخت کا عمل کیا ہے۔ لیکن جہاں سے ہم نے اسے دیکھا اور اس پر چڑھے وہاں سڑک اسے کاٹ کر نہیں بلکہ اس کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کے آپ ایک برج پر پہنچتے ہیں جس پر چھت بھی ہے۔ وہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے اور فرش اینٹوں کا ہے۔ یہ اینٹوں کا فرش بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ چودھویں اور سولہویں صدی میں بھی اس کی مرمت ہوئی ہے۔ بایں ہمہ نیچے کے آثار ضرور دو ہزار برس سے زیادہ پرانے ہونگے۔

یہاں سیر کو آنے والوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے اور اتوار کو بالخصوص۔ زیادہ تر لوگ ریل سے آتے ہیں اور ریل کے سٹیشن سے جو غالباً میل بھر دور ہے پیدل آتے ہیں۔ اس کے بعد میلوں تک چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آخری دو برجوں کے درمیان چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ ستر پچہتر درجے کا زاویہ بنتا ہوگا۔ اترنے میں گرنے کا اندیشہ زیادہ تھا۔ جوتا

پتھروں سے رپٹ رپٹ جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے نعلین در بغلین کیا یعنی اپنے جوتے ہاتھ میں لے لیے۔ جس نے دیکھا، تماشا سمجھا اور بچوں نے تو تالیاں بھی بجائیں۔

نیچے اس کے چھوٹا سا چائے خانہ ہے۔ وہاں چائے پی گئی اور پھر دیوار عظیم کے سائے میں تصویر کھنچوائی گئی۔ مسافر کو پرانی تہذیبوں اور گزرے زمانوں کے آثار ہر جگہ ہر ملک میں نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ دل کو فوراً گداز کرتے ہیں۔ ہم پر جو اثر شیراز میں مزار سعدیؒ کی زیارت پر ہوا ویسی کیفیت تو پھر یا اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی لیکن دیوار عظیم نے کہ اس کا احوال دنیا کے سات عجوبوں کے ضمن میں ہم نے بہت صغر سنی میں پڑھا تھا، ایک عجیب اثر جی پر چھوڑا۔ یا پھر دل گداختگی کی یہ کیفیت کنٹین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کے صحابی ابی وقاصؓ کے مقبرے اور نواحی قبرستان کے گل بوٹوں کو دیکھ کر طاری ہوئی۔

تو صاحبو! اب واپسی، لیکن راستے میں منگ بادشاہوں کے زیرِ زمین مقابر بھی دیکھتے چلو۔ یہ مقبرے کہ زمین کی سطح سے چالیس پچاس گز نیچے ہونگے۔ غالباً اس لیے زیرزمین بنائے گئے کہ بعد کے آنے والوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہیں۔ منگ وہ چینی خاندان تھا جس نے چنگیز خان کے وارثوں سے سلطنت چھینی اور عہد اس کا ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک ہے۔ یوں کہیئے کہ مقبروں والے یہ بادشاہ اکبراعظم کے ہم زمانہ تھے۔ صدیوں یہ مقبرے دنیا کی نظروں سے پنہاں رہے۔ (یہ غالباً پچھلی صدی کی بات ہے کہ تجسس کرنے والوں کو ایک لوح ملی جس میں ان کے راستے کی سمت مرموز تھی۔ برسوں کی کھدائی کے بعد ایک دروازہ تیغا کیا ملا۔ اندر اترے تو بند ایوانوں میں مقبروں کے علاوہ بڑے بڑے چینی کے ظروف میں انواع و اقسام کی نعمتیں موجود پائیں۔ سونے، چاندی اور جواہر کے ڈھیر لگے تھے۔ چوبی تابوت تو سیلن اور موسمی اثرات سے خستہ و خراب ہو کر مٹی ہو چلے تھے اور بعد میں دوبارہ انہی نقشوں پر بنوائے گئے لیکن باقی چیزیں سلامت تھیں۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد دروازوں کو کھولنا آسان نہ تھا۔ جن لوگوں نے دروازے بند کیے انھوں نے اندر کی بلیاں گرا کر ایسا انتظام کیا تھا کہ کوئی باہر سے نہ کھول سکے) لیکن دانشمندوں نے یہ گرہ بھی کھول ہی لی۔ عجیب آسیبی ماحول ہے۔ اوپر ستر اسّی فٹ اونچی چھت ہے۔ نیچے غلام گردشیں اور طاقچے۔ ایک بڑے ظرف میں قربان گاہ کی بتیوں کے لیے تیل بھرا تھا، اب بھی موجود ہے لیکن بہت گاڑھا ہو گیا ہے۔ اتنے میں ہمارے چینی دوستوں نے کہا ایک چیز اور رہ گئی ہے۔ ادھر آؤ۔

ایک بہت بوسیدہ چار پانچ سو برس پہلے کا چوبی دروازہ جھک کر پار کیا تو اندر پہنچ کر سب آنکھیں جھپکنے لگے۔ تو کیا منگ زمانے میں ہماری طرح کے صوفے، کرسیاں اور میز بھی ہوتے تھے! میزبان مسکرائے۔ اس دور کے اس بغلی

کمرے کو مہمانوں کی نشست کے لیے درست کرلیا گیا تھا۔ فقط دروازہ عہد قائم کا باقی رکھا تھا۔ سب بیٹھے، چائے آئی اور سب اپنی حیرانی پر ہنسے۔

معلوم ہوا کہ ابھی ایک دو مقبرے کھولے گئے ہیں۔ نشاندہی سترہ اٹھارہ کی ہو چکی ہے جو ان نواحات میں میلوں تک نصف دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

باہر آئے تو میزبانوں نے سب کو ٹھنڈا پلوایا۔ ٹھنڈا سے یہاں مطلب اورنج ہی لیجئے۔ ستر کروڑ کا یہ ملک دور جدید کے ان تمام لذائذ کوکا کولا، پیپسی کولا، سیون اپ، کناڈا ڈرائی اور فانٹا کو جانتا بھی نہیں۔ ان کے بغیر ہی ترقی کر رہا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے کر رہا ہے؟ جب یہ بیرونی نعمتیں اس کے دروازے، ہانگ کانگ اور پڑوسی جاپان تک میں موجود ہیں تو اپنے ہی سنگترے نچوڑنے پر اتنا اصرار کیوں؟

کھانے کی باتیں پھر کبھی سہی اب ذرا پینے کی بات سن لیجئے۔ عام آدمی کا مشروب گرم پانی ہے۔ آج سے نہیں صدیوں سے۔ یا تو گھر میں پتیلا چڑھا رہے گا ورنہ بازار میں دیگ اُبل رہی ہے وہاں سے دو پیسے میں بالٹی بھروا لائیے۔ طالب علم سکول جاتا ہے یا باہر تفریح کو تو اس کے بستے کے ساتھ ایک مگ لٹکا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ عیاشی مطلوب ہے تو چند پتیاں چائے کی ڈال لیجئے اور چسکی لیتے رہیے۔ جہاں گئے اسی مشروب سے خاطر ہوئی۔

وزیر خارجہ چن ژی نے بھی اسی سے تواضع کی اور فیکٹری مزدوروں نے بھی۔ بازار میں یہ چیز ایک پیسے کی ہے۔ گھر میں تو مفت ہی سمجھیے۔ اسی ایک مد میں دیکھا جائے تو ہم شکر اور دودھ کا جوشاندہ پیتے ہیں اس کے مقابلے میں چینی لوگ سال بھر میں کروڑوں روپے بچاتے ہونگے۔ ہم کالی چائے کے رسیا لوگوں کے لیے البتہ ہوٹلوں میں انتظام ہے۔ مزہ مٹھاس اور گاڑھا پن کبھی آجاتے ہیں۔ چینی زبان میں اسے "خونچا" کہتے ہیں۔

ریل میں ہر نشست کے ساتھ چائے کے گلاس رکھنے کی جگہ ہے۔ اکثر سینماؤں اور تھیٹروں میں کرسی کے داہنے ہتھے کے اندر گلاس رکھنے کے لئے سوراخ بنا ہے، کام کرتے جائیے اور ایک ایک گھونٹ چسکتے رہیے۔ تھوڑی دیر میں کوئی آئے گا اور اس میں مزید گرم پانی ڈال جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سے معدے کا نظام درست رہتا ہے۔ جراثیم کا دفعیہ بھی ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بلکہ بے خرچ بالانشین۔ ہم نے بھی کچھ دن گرم پانی پیا پھر چھوڑ دیا۔

کھانے سے پہلے اور بعد، بلکہ آپ یوں بھی باہر سے آئیں تو آپ کو گرم پانی میں بھیگا ایک تولیہ یا رومال پیش کیا جائے گا کہ اس سے منہ ہاتھ پونچھیے اور تروتازہ ہو جائیے۔ یہ رواج ہم لوگوں کو بہت اچھا لگا۔ وہاں خستگی اور ماندگی اس سے دور ہو جاتی تھی۔ ہمارے پیر سائیں حسام الدین راشدی صاحب نے تو کچھ تولیے وہاں سے خریدے بھی کہ

وطن عزیز جا کر میں بھی یہی کروں گا۔ لیکن وطن عزیز آ کر تو اور بھی بہت کچھ کرنے کا عزم ہمارے سارے ساتھیوں نے کیا تھا۔ کسی سے ایسے آثار بھی ظاہر نہیں ہوئے۔ شاید کان نمک میں آ کر پھر سب نمک ہو گئے۔ پیر صاحب تو لیے استعمال کرنے کی حد تک ثابت قدم رہے ہوں تو شاید رہے ہوں۔

صحت کا خیال چینیوں کو اس حد تک رہتا ہے کہ وحشت ہوتی ہے۔ ہم ایسے آرام طلبوں کو تو وہاں جینا حرام ہو جائے۔ ورزش ہر کوئی ہر روز کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ڈھاکے کے رہنے والے سڑکوں پر اتنا تھوکتے ہیں کہ ڈھاکہ میونسپلٹی کو ایک الگ داروغہ صفائی رکھنا پڑا ہے، جہاں یہ جاتے ہیں وہ سی آئی ڈی کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ ان کو وہاں بڑی تکلیف ہوئی کہ وہاں یہ رواج نہیں، نہ اجازت ہے۔ پانی اُبال کر پیتے ہیں۔ موبائل آئل وہاں گاڑیوں میں ڈالا جاتا ہے، اصلی یا بناسپتی گھی کہہ کر فروخت نہیں کیا جاتا۔ بھٹے کی اینٹیں بھی مکان بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ہلدی اور مرچ میں ملا کر ان سے تعمیر معدہ کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں دودھ بھی گائیوں بھینسوں کا ہوتا ہے۔ تالابوں یا کمیٹی کے نلکوں سے حاصل نہیں کیا جاتا۔ پھر محنت ہر کوئی کرتا ہے۔ لہٰذا سارے چین میں ہم ایسے کسی شخص کی تلاش میں رہے جو بڑی نہ سہی چھوٹی موٹی توند ہی کا مالک ہو۔ سوچو کے ہوٹل میں ہم نے کچھ چینی توندوں والے دیکھے تو خوش ہوئے اور وطن عزیز کی یاد آئی۔ لیکن معلوم ہوا وہ یہاں کے نہیں۔ سنگاپور سے بغرض تفریح آئے ہوئے ہیں۔ لاغر آدمی بھی چین میں کوئی نظر نہ آیا۔ واپسی پر ہمارے ایک امریکن دوست نے اس کی یہ توجیہ کی کہ جب کوئی غیر ملکی آتا ہے تو ڈھنڈورا پٹ جاتا ہے کہ لاغر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جائیں اور اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں تا کہ غیر ملکی لوگ متاثر ہو جائیں۔

ہم نے کہا وہاں تو کوئی ایسا وقت نہیں آتا کہ غیر ملکیوں کے غول کے غول نہ گھومتے پھریں اور کئی بار تو وہ بلا اطلاع بھی دیہات، کھیتوں، کارخانوں اور گلیوں میں جانکلتے ہیں چینیوں کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ وہ صاحب بولے۔ خیر آپ یقین نہیں کرتے، نہ سہی۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔

دوہان میں ہمارے ہسپتال جانے کی تقریب یہ تھی کہ وہاں کچھ فلو کا اثر معلوم ہوا۔ کم از کم زکام ضرور تھا۔ دیکھا کہ ڈاکٹر پر ڈاکٹر چلا آ رہا ہے۔ پھر اطلاع ملی کہ ہسپتال کا سربراہ ہم سے ملاقات کا متمنی ہے۔ آخر ہم نے کہا بابا ہم خود چلے جاتے ہیں ہسپتال۔ وہاں گئے تو انھوں نے ہمارے اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ اور آنکھ، کان، ٹانگ وغیرہ سب دیکھ ڈالے۔ دراصل اسی باعث ہم وہاں جانے سے کتراتے تھے اور خود کو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے کہ باقی سب لوگ وطن سدھاریں گے۔ ہم یہاں داخل دفتر ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ ہم جانتے ہیں کہ فارکوسا میں شاید ہی کوئی مرض ہوگا، جو ہم میں نہ ہوگا۔ خیر ہسپتال تو ہم داخل ہو کر نہ دیئے، دوا ضرور لے آئے اور ابھی استعمال بھی نہ کی تھی کہ تندرست ہو گئے۔

یہ ہسپتال ساڑھے سات سو بیڈ کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جرمن زبان میں سات سال تک ڈاکٹری پڑھی تھی اور بیس سال سے پریکٹس کر رہے تھے۔ ہمارے جی میں آئی کہ ان سے پوچھیں کہ آپ کینیڈا کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہاں ڈاکٹروں کو زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ یہ سوال پوچھا تو نہیں لیکن جی اس لیے چاہا کہ ہم خود کتنے ڈاکٹروں کو جانتے ہیں جو تنخواہ اور آمدنی کے لیے وطن عزیز چھوڑ کر کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ میں پریکٹس کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں آدھی موتیں بروقت ڈاکٹر میسر نہ آنے سے ہوتی ہیں۔ ان سے پوچھیئے۔ تو کہتے ہیں کہ ہاں وطن کی خدمت کرنے میں اعتراض نہیں لیکن یہاں ہماری قدر نہیں۔ ہمیں سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا جاتا۔ اس پر ہمیں اس چینی ادیب کی یہ بات یاد آئی کہ تنخواہ اور آمدنی کے علاوہ بھی کچھ قدریں ہیں، جن کے لیے آدمی کام کرتا ہے اور جاں سوزی برتتا ہے۔ ایسے ڈاکٹروں، انجینئروں اور دوسرے ماہروں کی تعداد سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے جو امریکہ اور یورپ کے ملکوں سے آرام اور تمول کی زندگی چھوڑ کر واپس آئے اور اب معمولی کپڑوں میں معمولی تنخواہ لے کر معمولی مکانوں میں رہتے ہیں۔ لیکن خوش ہیں۔ ہمارے ہاں ڈاکٹر کے لیے چند سال سرکاری خدمت لازم قرار دی گئی تھی تو کہرام مچ گیا تھا اور دیہات میں جانے کے نام سے تو ہر کوئی کان پر ہاتھ رکھتا تھا۔ وہاں دیہات کو بھی ملک کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور دیہاتی انسانوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا پانی، بجلی، تعلیم، صحت تفریح، تہذیب سب پر حق ہے۔ انٹلکچول کہلانے والے طبقے کے لوگوں ادیبوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں وغیرہ کو سال میں دو مہینے دیہات میں جا کر دیہاتیوں کے ساتھ انھی کے مکانوں میں رہنا پڑتا ہے اور انھی کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ یہ لوگ خود کو کوئی علیحدہ آسمانی مخلوق نہیں گردانتے اور اس قاعدے سے صدر ماؤزے تنگ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔

صحت میں علاج کی سہولتوں اور ورزش اور محنت کے علاوہ کچھ دخل خوراک کا بھی ہے۔ چینی روغن جوش نہیں کھاتے، سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ یہ رواج ہمارے ہاں کا ہے کہ جب تک کسی چیز کے تمام اجزاء کو جن میں وٹامن یا دوسری غذائیتیں ہونے کا خطرہ ہو، پوری طرح ضائع نہ کر دیا جائے مزا نہیں آتا۔ خیر اس مسئلے پر ہم زیادہ زور نہیں دینا چاہتے کیونکہ بہت سے ڈاکٹر، حکیم ہمارے حلقہ احباب میں ہیں ان کی خوشحالی پر آنچ آنے سے ہم سے خوش نہ ہوں گے تاہم گھروں کی اور کوچوں و بازاروں کی صفائی ہمیں بھی پسند ہے۔ وہاں کسی کو اپنے گھر یا گلی میں جھاڑو دینے میں عذر نہیں۔ ریل گاڑی تک کی دھلائی ہر روز ہوتی ہے۔

(چلتے ہو تو چین کو چلیئے)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) دیوارِ چین تعمیر کرنے کا مقصد کیا تھا؟

ب) مصنف جہاں بھی گیا تو کس طرح اُس کی خاطر مدارت ہوئی؟

ج) چینی کس طرح کی خوراک کھاتے ہیں؟

د) چین کے حالات پڑھ کر آپ نے کیا تاثر لیا؟

ہ) وزیر خارجہ اور فیکٹری مزدوروں کی مہمان نوازی میں کیا مماثلت تھی؟

۲۔ سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۳۔ سبق ''چلتے ہو تو چین کو چلیئے'' کے متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) دیوارِ چین کو کس بادشاہ نے مربوط کیا:

(i) چن شہ ہوانگ تی (ii) چن زی

(iii) چو چی منگ (iv) چاؤ چاپن

ب) دیوارِ چین پیکنگ سے دور ہے:

(i) دس پندرہ میل (ii) پندرہ بیس میل

(iii) بیس پچیس میل (iv) پچیس تیس میل

ج) حقیقت میں دیوار چین کی لمبائی ہے:

(i) ڈیڑھ ہزار میل (ii) اٹھارہ سو میل

(iii) دو ہزار میل (iv) بائیس سو میل

د) دیوار چین کی سیر کے لیے زیادہ تر لوگ آتے ہیں۔

(i) ہوائی جہاز کے ذریعے (ii) سڑک کے ذریعے

(iii) ریل کے ذریعے
(iv) پیدل

ہ) چین میں عام آدمی کا مشروب ہے۔

(i) اورنج جوس
(ii) گرم پانی
(iii) سبز چائے
(iv) کوکا کولا

و) چینی ڈاکٹرز، انجینئرز ترجیح دیتے تھے۔

(i) تنخواہ کو
(ii) آمدنی کو
(iii) خدمت کو
(iv) سہولیات کو

۴۔ متن کی روشنی میں خالی جگہ پُر کریں۔

الف) دیوارِ چین کی سیر کو آنے والوں کا ہمیشہ.................. رہتا ہے۔

ب) چینی زبان میں بلیک ٹی مع دودھ اور شکر کو.................. کہتے ہیں۔

ج) چینی.................. نہیں کھاتے۔

د) چین میں کسی کو اپنے گھر یا گلی میں جھاڑو دینے میں.................. نہیں۔

ہ) چین میں بقول مصنف صحت کا خیال اس حد تک رکھا جاتا ہے کہ.................. ہوتی ہے۔

۵۔ سیاق و سباق کے حوالے سے متن کی تشریح کریں۔

یہ غالباً پچھلی صدی کی بات ہے.................. نہ کھول سکے۔

۶۔ ذیل الفاظ کے معنی لکھ کر جملوں میں استعمال کریں۔

پنہاں۔ ظروف۔ دل گداختگی۔ دفعیہ۔ مرموز ۔ صغرسنی ۔ نواحات ۔ تیغا کرنا۔ خاطر مدارت

۷۔ مصنف نے دیوارِ چین کی جو منظر کشی کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۸۔ مصنف اپنے ملک کے ڈاکٹروں اور انجینئروں پر کس طرح طنز کرتے ہیں؟

سفرنامہ نگاری

سفرنامہ نگاری اُردو ادب میں ایک جدید صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا رہی ہے۔ سفری مشاہدات، تجربات اور وہاں کی تہذیب، تاریخ، معاشرتی زندگی اور دیگر اقدار کی بنیاد پر مرتب کردہ روداد سفر نامہ نگاری کہلاتی ہے۔ اُردو ادب میں یہ صنف دورِ جدید میں ترقی یافتہ شکل میں اُبھر کر سامنے آ رہی ہے۔

سرگرمیاں

ا۔ چینی اور پاکستانی معاشرے کا فرق اپنی کاپیوں میں لکھیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی سفر کی روداد لکھوائیں تاکہ طلبہ میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا ہو سکیں۔

اشاراتِ سبق

ا۔ طلبہ کو سفرنامے کی صنف کا کماحقہ تعارف کروایا جائے۔
۲۔ چین اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں طلبہ کی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔
۳۔ اُردو ادب میں ابن انشاء کے مقام سے آگاہ کیا جائے۔
۴۔ اُردو ادب میں سفرنامے کی روایت سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

جمیل الدین عالی

(حالاتِ زندگی)

خاندانی نام نوابزادہ مرزا جمیل الدین احمد خان تھا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو سر امیر الدین فرخ مرزا (والئی لوہارو) کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا نواب علاؤ الدین احمد خان (علاؤ الدین علائی) مرزا غالب کے شاگرد عزیز دوست اور قادر الکلام شاعر تھے۔ عالؔی کے والد سر امیر الدین احمد خان بھی اچھے شاعر تھے جبکہ والدہ سیدہ جمیلہ بیگم کا تعلق خواجہ میر دردؔ کے علمی و ادبی خاندان سے تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۴۴ء میں اینگلو عربک کالج دہلی سے بی۔اے کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۴ء کو طیبہ بانو سے شادی ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہوئے اور اسی سال وزارت تجارت میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۶۷ء میں نیشنل بینک آف پاکستان سے وابستہ ہو گئے اور ترقی کر کے سینئر ایگزیکٹو پریذیڈنٹ کے عہدے تک جا پہنچے۔ ۱۹۸۸ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

انھوں نے سرکاری خدمات کے ساتھ ادبی میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں حصہ لیا اور معتمد رہے۔ انجمن ترقی اُردو کے اعزازی معتمد ہونے کے ساتھ ساتھ کئی انجمنوں کے رکن رہے۔ عالؔی کی شاعری میں کلاسیکیت، جدیدیت اور روایت سے وابستگی کے رجحانات نمایاں ہیں۔ انھوں نے دوہے، غزل، نظم، گیت اور نغمے لکھے۔ خصوصاً دوہے کو نئی بلندیوں کی راہ دکھائی۔ کئی مشہور قومی نغموں کے خالق ہیں جن میں ''جیوے جیوے پاکستان، ہم مائیں ہم بہنیں ہم بیٹیاں، جو نام وہی پہچان، ہم مصطفوی مصطفوی ہیں'' مشہور ہیں۔ بطور کالم نگار قومی اخبارات میں ''اظہاریے'' کے نام سے طویل عرصے تک کالم لکھتے رہے۔ پاکستان ٹیلی وژن کے لئے لازوال ڈرامے لکھے۔ اُن کا کلام ''دوہے'' کے (تین ایڈیشن) ''دنیا میرے آگے''، ''تماشا میرے آگے''، ''حرفے'' (تین ایڈیشن)، کالموں کا مجموعہ، اظہاریے اور کئی کتب کے تراجم انکا بیش بہا ادبی سرمایہ ہیں۔

علمی ادبی اور قومی خدمات پر عالؔی کو آدم جی ایوارڈ ۱۹۶۳ء، یونائیٹڈ بینک لٹریری ایوارڈ ۱۹۶۵ء، حبیب بینک لٹریری ایوارڈ ۱۹۶۵ء، کینیڈین اُردو اکیڈمی لٹریری ایوارڈ ۱۹۸۸ء، حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ برائے حُسن کارکردگی ۱۹۹۱ء اور ہلالِ امتیاز ۲۰۰۴ء میں عطا کیا گیا۔ ۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۳ء سینٹ آف پاکستان کے رکن بھی رہے۔

۲۳ نومبر 2015ء کو کراچی میں وفات پائی۔

بابل کے کھنڈرات

(جمیل الدین عالی)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو 'بابل کے کھنڈرات' کی تاریخ سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں صنف سفرنامہ نگاری کی روایت اور اہمیت بتانا۔
- طلبہ کو جمیل الدین عالی کی اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں جمیل الدین عالی کا مقام بتانا۔

الفاظ و تراکیب

قدامت	پاداش	قانون دہندہ	پیچ در پیچ	عظمت رفتہ	بامِ عروج
دہریہ	مخبوط الحواس	ارتعاش	شاہانہ نمود	ریشم و سنجاب	

بابل...... جس کی قدامت اور عظمت کے بارے میں بے شمار کہانیاں، روایتیں، اندازے اور انکشافات ''کتابِ مقدس'' کے اوراق سے لے کر ہیروڈٹس یونانی سیاح جیسے عینی گواہوں اور بیسویں صدی کے جرمن ماہرین آثار قدیمہ کی کتابوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بابل جو انسانی تاریخ کے اوّلین بابوں میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں اٹھارہویں صدی قبل مسیح یعنی اب سے تین ہزار سات سو برس پہلے شہنشاہ حمورابی نے سوسائٹی کے لیے وہ دستور اور قوانین بنائے تھے جن کے سبب وہ حمورابی قانون دہندہ کہلاتا ہے۔ حمورابی کی قانون سازی معاشرتی حقوق و فرائض کی پیچ در پیچ عمارت کی پہلی بنیادوں میں شامل ہے۔ تین ہزار سات سو برس پہلے بہت سے ملک تہذیب تو کیا انسانی آبادی سے بھی محروم تھے۔

مگر جو بابل ہم دیکھ رہے ہیں وہ بخت نصر کا بنایا ہوا بابل ہے کیونکہ حمورابی کا بابل سولہویں صدی قبل مسیح میں بیرونی حملہ آوروں نے بڑی حد تک تباہ کر دیا تھا اور پھر کم زور سلطنتوں کے عروج و زوال میں اسے نو صدیوں تک اپنی عظمت رفتہ واپس نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی قبل مسیح کے طاقت ور شہنشاہ بختِ نصر نے اسے دوبارہ بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ بختِ نصر نے چوالیس برس حکومت کی اور اس کے زمانے میں دجلہ و فرات کے درمیان اس اونچی فصیلوں والے شہر سے وہ تہذیب ابھری جس کی یادیں اور یادگاریں یورپ و امریکہ کی شان و شوکت سے آنکھیں لڑاتی ہیں۔

بختِ نصر دہریہ تھا یعنی خدا یا دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا اور اسی لیے اپنی حوصلہ مندی اور طاقت کے باوجود اپنی قوم میں غیر مقبول ہو گیا۔ شاید یہی سبب تھا کہ اس کے بعد بادشاہی اس کے خاندان میں قائم نہ رہ سکی اور اس کی موت کے بعد بہت جلد شہنشاہ ایران سائرس نے بابل پر قبضہ کر لیا۔

ہاں یہ وہی بابل ہے جہاں ہندوستان سے واپسی پر سکندرِ اعظم نے مسلسل تین دن تین رات جشن منایا اور تین

دن بیمار رہ کر مر گیا۔ اب وہ بابل کھنڈر ہے۔ آثار قدیمہ کا ایک گوشہ ہے اور ہم بیسویں صدی کے کمزور بے طاقت سیاح ان محلات کے ان حصوں میں گھوم رہے ہیں جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہاں کوئی پہرے دار نہیں جو ہمیں ان عشرت خانوں میں داخل ہونے سے روک دے کوئی محتسب نہیں جو ہماری گفتگو پر ہماری تنقید پر پابندی لگا سکے۔ مجھے بابل کے کھنڈروں میں گھومتے ہوئے ایک عجیب سی آزادی اور خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ہمارا گائیڈ ایک مفلوک الحال عراقی ہے مگر وہ ایک صحت مند اور ہنس مکھ آدمی ہے، انگریزی صاف اور تیزی سے بولتا ہے۔

''ہاں بیٹا بخت نصر''۔ وہ چوک میں کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے۔ اب ہم سے بات کرو میں روز غیر ملکی سیاحوں کو تمہارے محلات کی سیر کراتا ہوں اور تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم اس ملک کے سب سے زیادہ باجبروت بادشاہ تھے۔ تمہاری آنکھ کے ایک اشارے پر موت اور دوسرے پر زندگی رقص کرتی تھی۔ اب بولو بیٹا! میں تمہارے دارالسلطنت کے دل میں کھڑا ہو کر تمہیں القاب و آداب کے بغیر پکار رہا ہوں۔ کہاں ہیں، تمہاری سوار اور پیادہ فوجیں؟ کہاں ہیں، کہاں ہیں تمہارے خفیہ اور باوردی محتسب؟ تم ایک مطلق العنان شہنشاہ تھے مگر تم مر گئے اور ختم ہو گئے اور تمہارا جاہ و جلال اور دبدبہ تمہارے ساتھ ختم ہو گیا اور میں ایک چھوٹا آدمی ہوں مگر میں زندہ ہوں اور زندہ رہوں گا۔ میں عامی ہوں، عام آدمی۔ تاریخ تم پر ہنستی اور مجھ سے شرماتی ہے۔

بخت نصر کوئی جواب نہیں دیتا، کسی سمت سے کوئی تیر نہیں چلتا جو اس کے سینے میں پیوست ہو جائے، کوئی تلوار کوئی خنجر نہیں جو اس کی زبان قلم کر دے، یہ عراقی گائیڈ مخبوط الحواس سہی مگر اس کی زبان وقت کی زبان ہے جو کٹ نہیں سکتی۔ آج وہ شہنشاہ جس کے نام سے عراق، شام اور ایران کانپتے تھے۔ ایک معمولی سے گستاخ گائیڈ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ہاں موت سب کو آتی ہے مگر وہ اچھی طرح یاد کیے جاتے ہیں جنہوں نے کچھ کام دوسروں کے لیے بھی کیے ہوں۔ کل میں حضرت امام حسینؓ کی قتل گاہ بھی دیکھ آیا ہوں جن کی موت اس طرح ہوئی تھی کہ ان کی لاش کو سینکڑوں گھڑ سواروں نے تپتی ہوئی دھوپ میں روندا تھا اور بخت نصر کی موت اس طرح ہوئی ہوگی کہ بے شمار فوجوں کے پیچھے سینکڑوں کنواریاں ریشمی، لبادے پہنے خوشبوئیں لگائے میٹھی میٹھی آوازوں میں گیت گاتی ہوئی اس کا تابوت کھینچ کر سونے چاندی سے لپے ہوئے مندر میں لے گئی ہوں گی اور لاکھوں روپے اس کی آخری رسموں پر خرچ ہوئے ہوں گے۔

مگر میں حضرت امام حسینؓ کے مزار پر رویا اور روتا رہا اور بختِ نصر کے محل پر مجھے ہنسی آتی ہے اور شاید یہ ہنسی عبرت کا ایک ذریعہ اظہار ہے۔

اُونچے اُونچے مکاں تھے جن کے بڑے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے

اوران استخوانوں کی خاک پر کھڑے ہو کر ہم شہر بابل کا تماشا دیکھتے ہیں۔

اس مقام کا سب سے زیادہ پُر اثر منظر باب عشتار کا ہے۔عشتار گیٹ یا اُردو کے چٹخارے میں عشتاری دروازہ جو سرخی مائل پکی اینٹوں کا بنا ہوا کئی گز اُونچا دروازہ ہے۔ یہ گویا وسطِ شہر میں ایک یادگار عمارت تھی جس کے بیچ میں سے ایک شاہراہ جلوس کوئی نصف میل تک سیدھی چلی جاتی ہے۔ دروازہ عشتار دیوی سے منسوب ہے۔ یہ دروازہ اژدہوں اور جوان بیلوں کی تصویروں سے مزین ہے جو اینٹوں پر کھودی گئی ہیں۔ یہاں سے جو شاہراہ جلوس سامنے جاتی ہے۔ اس کے دونوں طرف کی دیواروں پر ببر شیروں کے ایک سو بیس نقوش کھودے گئے تھے۔ خود باب عشتار پر ایک اندازے کے مطابق ساڑھے پانچ سو اژدہوں اور بیلوں کے نقوش بنائے گئے تھے۔ دروازے کے اوپر اس حصے پر جس کے قریب میں کھڑا تھا رنگ دار چمکیلی اینٹیں چسپاں ہیں۔ ان اینٹوں پر رنگ کی تہہ چڑھائی گئی تھی جو پونے تین ہزار برس گزر جانے پر بھی اسی طرح قائم ہے۔ تہذیب بابل پر کام کرنے والوں نے سلطنت بابل ونینوا کے سینکڑوں آثار اَن گنت کتابوں میں مذکورہ کیے ہیں جو جانوروں اور انسان نما جانوروں کی تصویروں اور وضاحتی علامتوں سے پُر ہیں۔ یہ علامتیں طرح طرح کے خوف وعزائم کی کہانیاں سناتی ہیں۔

باب عشتار کے جنوب مغرب شاہی محلات کا علاقہ ہے جو تیرہ ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا۔ایک محل کے سامنے کھڑے ہو کر میں بڑی اتراہٹ کے مارے ادھر اشارہ کرتے ہوئے تصویر کھینچوا تا ہوں (اور بعد میں اس حچھٹ پٹے پر شرماتا ہوں)۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے بابل کی دولت وحشمت کے غلغلے اس طرح اٹھے کہ ان کے ارتعاش آج بھی ہمارے ادب میں صاف سنائی دیتے ہیں۔ اس علاقے میں عمارتوں کے پانچ بڑے بڑے سلسلے تھے جن میں سے وسطی عمارت ایک بہت بڑا دربار ہال یا دیوان تھا۔ جس میں نیلی چمکدار اینٹوں کا کام تھا۔ اس وسیع عمارت کی بوجھل چھت بنانے والے انجینئرنگ کے ترقی یافتہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ شاید یہی وہ دیوان یا دربار ہے جس کی دیوار پر عین جشن ضیافت کے وقت ایک غیبی ہاتھ نے چمکتے ہوئے لفظوں میں زوال بابل کی پیشن گوئی لکھ دی تھی۔ اس روایت نے بعد میں بہت سی زبانوں کو اس مضمون سے ملتے جلتے محاورے دیئے ہیں۔ اس دربار ہال کی دیوار پر زوال بابل کی غیبی پیشن گوئی کا نمودار ہونا شاید صرف ایک کہانی ہو مگر یہ کہانی وقت اور تاریخ کی سب سے زیادہ نمایاں اور

مسلسل حقیقت ہے۔ ہر دور میں یہی ہوتا ہے کہ پہلے وقت کے ہاتھ نسلوں اور قوموں کے سامنے دیوار پر تنبیہی تحریریں لکھتے ہیں اور اگر وہ راستی پر نہ آجائیں تو ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ یہ تحریریں ہزار ہا برس سے لکھی جارہی ہیں اور انھیں دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں مگر پھر بھی کچھ نہیں سمجھتے۔

''کیا یہ بابل عظیم نہیں ہے۔ جسے میں نے اپنی شاہانہ نمود کے لیے بنایا ہے۔'' یہ بختِ نصر کی تحریر ہے جسے جرمن ماہرین نے بالآخر پڑھ لیا ہے۔

ہاں یہ اس شہر کا حال ہے جو دو دریاؤں کے بیچ میں ایک بلندی پر واقع ہے اور جس کے گرد تہہ در تہہ فصیلیں اور دیوار اندر دیوار محلات اور مندر تھے تاکہ حملہ آوروں کی مزاحمت قدم قدم پر کی جاسکے۔ یہ شہر تقریباً ڈھائی ہزار برس قبل مسیح سے لے کر سکندر اعظم کے زمانے تک پوری ہمعصر اور بعد کی دنیا کے لیے ایک مرقع حیرت بنا رہا۔ جہاں اکادمی رسم الخط اور طرز تحریر پیدا ہوا جہاں دنیا کی پہلی انسائیکلو پیڈیا ترتیب دی گئی۔ جہاں چھتوں پر باغ تھے۔ ہینگنگ گارڈن جہاں سڑکیں ایک دوسرے کو سیدھی اس طرح کاٹتی تھیں جیسے نیویارک کی سڑکیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ اس وقت یورپ اور امریکہ میں بسنے والی قومیں شاید کھالیں پہن کر ستر پوشی کرتی ہوں گی، جب بابل کے صنعت کار ریشم وسنجاب کے ملبوسات تیار کر کے ہندوستان اور مصر بھیجتے تھے۔ ایسے وقت میں اپنے موہن جوڈارو کے انکشافات مکمل ہونے پر شاید بابل ونینوا کی تہذیبیں نو دولتوں کی طرح لگیں گی مگر موہن جوڈارو پر ابھی تک لاعلمی اور قیاس کی کُہر چھائی ہوئی ہے۔

تو یہ ہے بابل۔ سرخ پتا اینٹوں اور نیلی اور زرد چمکدار اینٹوں کا ویرانہ، بے شمار دیوی دیوتاؤں کا معبد۔ حمورابی اور بختِ نصر اور سکندر اور سائرس کا بابل۔ جب اس کی کھدائی کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا اور جرمن ماہرین اینٹیں اور مجسمے کھلے چھوڑ گئے تو قریب کے گاؤں حلہ کے باشندوں نے بے شمار مسالہ اپنے چھوٹے چھوٹے گھر اور سڑکیں بنانے میں استعمال کیا۔ عشتاری دروازے کا بہت سا مال جرمن ماہرین لے گئے تھے جو انھوں نے برلن کے عجائب خانے میں استعمال کیا۔ اس عجائب خانے پر بھی جنگ عظیم میں بمباری ہوئی اور وہ تقریباً تباہ ہو گیا۔

ہاں یہ بابل ہے جو کسی مورخ یا مبصر یا اہل دل کے الفاظ میں پہلے شہر عظیم تھا اور اب صحرائے عظیم ہو کر رہ گیا ہے۔

اے آنکھوں والو! دیکھو اور عبرت پکڑو۔

کھنڈروں کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرا ہے جو عجائب خانے کا کام دیتا ہے۔ یہاں قدیم تحریروں، روایتوں، نقشوں اور موجودہ آثار کی بنا پر قدیم شہر کا ایک نمونہ تیار کیا گیا ہے جسے دیکھنے سے عجیب عجیب اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ شہر کی ترتیب، وہ رکھ رکھاؤ، وہ دمدموں اور فصیلوں کی ترتیب اور مضبوطی۔ جب اس کی مضبوط سڑکوں پر شہسوار گھوڑے

کتراتے ہوں گے تو کیا کسی کو خیال آتا ہوگا کہ ایک دن ہم اور ہم جیسے بے شمار سیاح شہر سے متعلق عجائب خانوں میں حیرت سے اس کا ماڈل دیکھا کریں گے۔

سلطنت بابل اور سلطنت نینوا کی رقابت کی کہانیاں دونوں میں حربی اور فنی مقابلوں اور ان سب کے پیشرو آشوریوں کی تہذیب اور اس کے آثار وفنون لطیفہ کی داستانیں سینکڑوں کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ ان کتابوں میں بادشاہوں، دیوتاؤں اور جانوروں کے مجسموں کے مرقعے اور ان پر تفصیلی تحقیق کے نتائج درج ہیں مگر ان کا ذکر ایک باقاعدہ مورخ کا کام ہے جو میں نہیں ہوں۔ میں تو ایک چھوٹا سا آئینہ ہوں جسے اتفاقات نے عالمی گردش میں ڈال دیا ہے۔ میں وہی کچھ بیان کرسکتا ہوں، جس کا عکس میرے ذہن میں اُبھرتا ہے۔ شیشے کے ٹکڑے اور انسانی ذہن میں یہ فرق ضرور ہے کہ شیشے پر گزرتے ہوئے نقوش مٹتے جاتے ہیں اور ذہن کی تہیں انھیں جذب کرتی رہتی ہیں۔

چلتے چلتے میں نے سوچا کہ اگر کبھی میرا گزر نیویارک سے ہوا اور اگر وہاں مجھے کسی گائیڈ نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ یا آزادی کا مجسمہ دکھاتے وقت لاف زنی کی تو بابل کا تجربہ یا مشاہدہ میرے کام آنا چاہیے۔ ایک طفلانہ جوش کے ساتھ میں بھاگا ہوا واپس گیا اور عشتاری دروازے سے ایک اینٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ لیا (جو قانوناً جرم ہے) پھر میں نے عجائب خانے کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بچے سے آٹھ آنے میں قدیم بابل کے ماڈل کا پکچر کارڈ خریدا اور یوں فاتحانہ موٹر کی طرف چلا جیسا حمورابی کی بجائے اس کی کتاب قانون کا مصنف میں تھا اور اب شہنشاہ بختِ نصر کے تخت پر براجمان ہونے جارہا ہوں۔

(دنیا میرے آگے)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) بابل کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ب) حمورابی قانون دہندہ کیوں کہلاتا تھا؟

ج) دورِ بخت نصر کا ایک اہم کارنامہ کیا تھا؟

د) گائیڈ نے بخت نصر کو کیوں کر للکارا؟

ہ) بابل کے کھنڈرات پر گھومتے ہوئے مصنف نے احساسِ آزادی کیوں محسوس کیا؟

و) مصنف حضرت امام حسینؓ کے مزار پر کیوں رو پڑے؟

ز) نیویارک اور بابل میں کیا مماثلت تھی؟

ح) مصنف نے بچے سے کیا خریدا اور اس کے احساسات کیا تھے؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) بخت نصر نے بابل پر حکومت کی۔

(i) چالیس برس (ii) چوالیس برس

(iii) اڑتالیس برس (iv) پچاس برس

ب) بخت نصر کے بعد بابل پر قابض ہوا:

(i) شہنشاہ ایران (ii) شہنشاہ روم

(iii) شہنشاہ برطانیہ (iv) شہنشاہ شام

ج) شاہی محلات کا علاقہ پھیلا تھا:

(i) دس ایکڑ (ii) گیارہ ایکڑ

(iii) بارہ ایکڑ (iv) تیرہ ایکڑ

د) بابل کھنڈرات کا سب سے زیادہ پُر اثر منظر تھا:

(i) بابِ عشتار (ii) شاہی محلات

(iii) عجائب خانہ (iv) پھانسی گھاٹ

ہ) سلطنت بابل کی رقابت تھی:

(i) ہندوستان سے (ii) ایران سے

(iii) نینوا سے (iv) افغانستان سے

۳۔ متن کے مطابق درست کی نشان دہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) بخت نصر مذہبی لحاظ سے دہریہ تھا۔

ب) سکندر اعظم کا انتقال بابل میں ہوا۔

ج) بابِ عشتار ایک دیوتا سے منسوب ہے۔

د) بابل دو دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔

ہ) بابل کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر مصنف نے غلامی کا احساس کیا۔

۴۔ متن کے مطابق درست لفظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

الف) سائرس.................کا شہنشاہ تھا۔ (ایران ۔ ہندوستان ۔ شام)

ب) بابل میں دنیا کی پہلی.................مرتب کی گئی۔ (لغت ۔ انسائیکلو پیڈیا ۔ مذہبی کتاب)

ج) بابل پر................. ماہرین نے تحقیق کی۔ (جرمنی ۔ فرانسیسی ۔ امریکن)

د) مصنف بخت نصر کے محل پر.................تھا۔ (روتا ۔ ہنستا ۔ خوش ہوتا)

ہ) بخت نصر کا اپنی قوم میں غیر مقبول ہونے کی وجہ اُس کا.................ہونا تھا۔

(دہریہ ۔ ظالم ۔ عیاش)

۵۔ سیاق و سباق کے حوالے سے متن کی تشریح لکھیں۔

چلتے چلتے میں نے سوچا کہ اگر میرا گزر................. براجمان ہونے جا رہا ہوں۔

۶۔ سلطنت بابل کی تاریخ اور تہذیب پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

۷۔ متن کی روشنی میں درج ذیل جملوں کی مختصر وضاحت کریں۔

الف) اور اب میں شہنشاہ بخت نصر کے تخت پر براجمان ہونے جا رہا ہوں۔

ب) تاریخ تم پر ہنستی اور مجھ سے شرماتی ہے۔

ج) جہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا۔

د) کوئی محتسب نہیں جو ہماری گفتگو پر پابندی لگا سکے۔

روداد نویسی

روداد فارسی زبان کا لفظ ہے جو حقیقت حال کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا ان حالات و واقعات کی تفصیل ہوتی ہے۔ جو کسی شخص کا مشاہدہ یا تجربہ ہو۔ انگریزی میں اسے رپورٹ کہتے ہیں۔ روداد نویسی سے مراد کسی تقریب، جلسے، میلے یا حادثے کا آنکھوں دیکھا حال، ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے کاغذ پر تحریر کر کے پیش کرنا۔ گویا اس تقریب یا واقعہ کی تلخیص بھی ہے اور جائزہ بھی۔ مگر یہ مضمون سے مختلف ہوتی ہے۔ روداد نویسی میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اسے اختصار، ترتیب اور حسن ادا کے ساتھ سپرد قلم کرتے ہیں تا کہ وہ لوگ جنہوں نے اس تقریب کو نہیں دیکھا۔ وہ غائبانہ لطف اندوز ہو سکیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی سفر، میلے یا تقریب کی روداد سنیں اور لکھوائیں۔

۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مختلف اقسام کے تبادلہ و ترقی کے لیے محکمانہ درخواستیں لکھوائیں۔

۳۔ اساتذہ کرام طلبہ کو لائبریری میں لے جا کر مختلف سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں سے متعلق معلومات فراہم کریں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو ادب میں صنف سفرنامہ نگاری کی اہمیت اور اسے لکھنے کی تکنیک سے آگاہ کریں۔

۲۔ سفرنامہ "بابل کے کھنڈرات" کے تاریخی پس منظر سے آگاہ کریں۔

۳۔ جمیل الدین عالی کی طرزِ تحریر سے متعارف کروائیں۔

مرزا غالب (بحیثیت نثر نگار)

(حالاتِ زندگی)

مرزا غالب ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام اسد اللہ خان، شروع میں تخلص اسدؔ بعد میں غالبؔ رکھا۔ اِن کے والد مرزا عبداللہ بیگ پہلے اودھ کے نواب آصف الدولہ اور نواب نظام علی خان کے درباروں سے منسلک رہے اس کے بعد وہ راجہ بختاور سنگھ کی فوجی ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔

اِن کا شمار اُردو کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو نثر میں بھی انھیں بلند مقام حاصل ہے۔ اُردو نثر کا کل سرمایہ، نجی خطوط پر مشتمل ہے جو انھوں نے دوستوں اور شاگردوں کے نام تحریر کیے۔ مرزا غالب نے قدیم نثر کو ترک کر کے جدید نثر کی بنیاد ڈالی اور اُسے اپنے ہاتھوں سے پروان بھی چڑھایا۔ مرزا غالب سے پہلے خطوط میں بڑے بڑے القاب و آداب لکھے جاتے تھے اور خط کی عبارت کو لفظوں کی آرائش و زیبائش سے مرصع کیا جاتا تھا۔ مگر انھوں نے اس روایت سے ہٹ کر سہل نگاری کی بنیاد ڈالی۔ غالب نے سب سے پہلے خطوط نویسی میں مکالمہ نگاری کا آغاز کیا۔ اکثر خطوط اِس انداز سے لکھے، جیسے دو اشخاص روبرو بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔

اِن کے خطوط کی زبان سادہ، رواں، روزمرہ اور محاورے کے مطابق ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی شوخیِ تحریر ہے جو مکتوب الیہ کے رُتبے اور مذاق کے مطابق ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی ظرافت کے بے مثال نمونے غالب کے خطوط میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے خطوط طنز و ظرافت کا مرقع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح ان کی ظرافت بے مثال ہے۔ طنز کی ضرب بھی کاری ہے۔

ان کے خطوط کے مطالعے سے ہمیں نہ صرف ان کے ذاتی حالات معلوم ہوتے ہیں بلکہ اُس دور کے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، علمی و تمدنی زندگی، جنگِ آزادی کی تفصیلات اور انگریزوں کے ظلم وستم کے بارے میں بھی بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ غالبؔ نے خطوط نویسی کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا۔ ان کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں ہوا۔

خطوطِ غالب

(مرزا غالب)

مقاصدِ تدریس

- اُردو ادب میں مکتوب نگاری کی روایت بتانا۔
- اُردو ادب کے ابتدائی نثری فن پاروں میں مکاتیب غالب کی اہمیت بتانا۔
- غالب کے اُسلوب نثر سے متعارف کرانا۔
- طلبہ کو اس قابل بنانا کہ وہ مکتوبات کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بتانے کے قابل ہوسکیں۔

الفاظ و تراکیب

تلف	مدار	ننگ آفرینش	وسوسہ	تردُد
آزردہ	آئینِ مناسب	رفع	ناز	دیباچہ

مکتوب نمبر۱
قاضی عبدالجمیل جنون کے نام

قبلہ!

آپ کا خط پہنچنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ گاہے گاہے انگریزی میں بھی اور ڈاک کے ہرکارے میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلّہ بھی ضروری نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے رہے اور مجھ کو بلی ماروں میں خط پہنچتا رہا۔

یہ اب کے آپ نے حکیم کالے کا نام کیسا لکھا ہے؟ اُس غریب کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا۔ جو آپ نے بھیجا وہ مجھ کو پہنچا۔ جواب لکھنے میں جو میری طرف سے قصور ہوتا ہے، اس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت مہینہ بھر میں نو پتے لکھتے ہیں۔ میں کہاں تک یاد رکھا کروں؟ ایک مکان ہو تو لکھ رکھوں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں؟ میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں؟

اب آپ کے خط میں تین مطلب جواب لکھنے کے قابل تھے۔ ایک وہ رباعی جو آپ نے اس ننگ آفرینش کی مدح میں لکھی ہے۔ اُس کا جواب بندگی ہے اور کورنش اور آداب۔ دوسرا مدعا خط کے نہ پہنچنے کا وسوسہ، سو اس کا جواب لکھ

چکا۔ تیسرا امر جناب مولوی اللہ یار خاں صاحب کا میرے ہاں آنا اور میرا اُس وقت مکان میں موجود نہ ہونا۔ واللہ مجھ کو بڑا رنج ہُوا۔ اگر آپ سے ملیں تو میرا اسلام کہیے گا اور میرا ملال اُن سے بیان کیجیۓ گا۔ صبح کو میں ہر روز قلعے کو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے۔ جب سوار ہو جاتا ہوں، تب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھے، حُقہ پیتے۔ اگر قلعے جاتا ہوں تو پہر دن چڑھے آتا ہوں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؟

نگاشتہ نہم ربیع الاول ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء

از اسد

مکتوب نمبر ۲
منشی نبی بخش کے نام

لو صاحب اور تماشہ سنو، آپ مجھ کو سمجھاتے ہیں کہ تفتہ کو آزردہ نہ کرو۔ میں تو ان کے خط کے نہ آنے سے ڈرا تھا کہ کہیں مجھ سے آزردہ نہ ہوں، بارے جب تم کو لکھا اور تم نے بہ آئین مناسب ان کو اطلاع دی، تو انھوں نے مجھ کو خط لکھا۔ چنانچہ پرسوں میں نے اسی خط کا جواب بھیج دیا۔ تمہاری عنایت سے وہ جو ایک اندیشہ تھا، رفع ہو گیا۔ خاطر میری جمع ہو گئی۔ اب کونسا قصہ باقی رہا کہ جس کے واسطے آپ ان کی سفارش کرتے ہیں۔ واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزندوں کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا فرزند عطا کیا ہے۔ رہا دیباچہ، تم کو میری خبر ہی نہیں۔ میں اپنی جان سے مرتا ہوں۔

؎ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل　　گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں، اور مجھ کو معاف رکھیں۔ اللہ نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے۔

غالب

(خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر)

مشق

۱) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) غالب کو خطوط کیوں آسانی سے پہنچ جاتے تھے؟

ب) غالب نے جنون کے نام خط میں کن تین مطالب کا ذکر کیا ہے؟

ج) قاضی عبدالجمیل جنون کس پتا پر خط لکھتا تھا اور غالب کہاں وصول کرتا تھا؟

ر)   غالب کو تفتہ پر کس بات کا ناز تھا؟

ز)   "میں اپنی جان سے مرتا ہوں" پہلے خط کے اِس جملے سے غالب کی کیا مراد ہے؟

۲)   متن کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف)   قاضی عبدالجمیل جنوں کے نام خط لکھا تھا۔

(i) ۱۸۵۵ء   (ii) ۱۸۵۰ء

(iii) ۱۸۳۱ء   (iv) ۱۸۵۷ء

ب)   آپ لال کنواں لکھتے رہے اور خط مجھے ملتا رہا۔

(i) لال قلعہ میں   (ii) بلی ماروں میں

(iii) کوچہ حکیم کالے میں   (iv) کوچہ کریم خان میں

ج)   اُس غریب کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں۔

(i) مرزا تفتہ   (ii) علاؤالدین علائی

(iii) حکیم کالے   (iv) مولوی اللہ یار خان

د)   میں تو اُن کے خط نہ آنے سے ڈرا تھا۔

(i) علاؤالدین علائی کے   (ii) تفتہ کے

(iii) مولوی اللہ یار کے   (iv) منشی نبی بخش کے

ہ)   پہلے خط میں غالب کی "انگریزی" سے مراد ہے۔

(i) انگریزی زبان   (ii) انگریز قوم

(iii) ڈاک والے   (iv) انگریز حکومت

۳)   "خطوط غالب" کی روشنی میں درست کی نشاندہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف)   عبدالجمیل جنوں کے نام خط کے مطابق غالب کو مولوی اللہ یار خان سے ملاقات نہ ہونے کا رنج ہوا تھا۔

ب)   حکیم کالے خان کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں۔

ج)   پوسٹ ماسٹر میرا آشنا نہیں۔

د)   میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا۔

ہ) تمہاری عنایت سے وہ جو ایک اندیشہ تھا۔ رفع ہو گیا۔

و) واللہ! تفتہ کو میں اپنے بھائی کی جگہ سمجھتا ہوں۔

۴) ۔ ذیل جملوں کی مختصر وضاحت کریں۔

الف) مجھے ناز ہے، کہ اللہ نے مجھے ایسا فرزند عطا کیا ہے۔

ب) ایک تو یہ کہ حضرت مہینہ بھر میں نو پتے لکھتے ہیں۔

ج) میرا مکاں میں موجود نہ ہونا۔ واللہ مجھ کو بڑا رنج ہوا۔

د) تب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔

ہ) یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں گے۔

خطوط نویسی

خط کے لغوی معنی نوشتہ، تحریر، نامہ یا چٹھی کے ہیں۔ خط کو مکتوب بھی کہتے ہیں۔ خط لکھنے والے کو ''کاتب'' اور جس کو خط لکھا جائے ''مکتوب الیہ'' کہتے ہیں۔ خط نویسی ہماری زندگی کی اہم ضرورت ہے۔ ہم اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں سے کوسوں دور بیٹھے خط کے ذریعے باتیں کر لیتے ہیں۔ جب ہم خط لکھ یا پڑھ رہے ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔ خط کے ذریعے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔

یہ سراسر شخصی تحریر ہے۔ جس سے لکھنے والے کی شخصیت، مزاج، علم اور کردار و گفتار کا پتا چل جاتا ہے۔ اس لیے خط لکھتے وقت بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ مبادا کوئی ایسی بات آپ کے قلم سے نکل جائے۔ جس سے آپ کی شخصیت بھی متاثر ہو اور پڑھنے والے بھی منفی اثرات قبول کریں۔

خط تین قسم کے ہوتے ہیں:

نجی خطوط، دفتری یا سرکاری خطوط اور کاروباری خطوط۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے کسی ادبی علمی تحریر کا فنی و فکری لحاظ سے تجزیہ کروائیں۔

۲) اساتذہ کرام طلبہ سے روزمرہ زندگی کے مسائل کے حوالے سے غیر رسمی خطوط لکھوائیں نیز داخلہ فارم/شناختی کارڈ فارم پُر کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اساتذہ کرام سبق پڑھانے سے پہلے مرزا غالب کی شخصیت پر مختصراً روشنی ڈالیں۔

۲) خطوطِ غالب میں جس طرح کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت کریں۔

۳) اساتذہ کرام طلبہ کو غالب کے چند اور خطوط پڑھنے کی تاکید کریں۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (بحیثیت نثر نگار)

(حالاتِ زندگی)

علامہ محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم مسجد میں حاصل کی۔ قرآن پاک ناظرہ پڑھا پھر مشن ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ جہاں سید میر حسن جیسے مشفق اُستاد مل گئے جن سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں سے ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔

بعد ازاں اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ کے لیکچرار تعینات ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے بیرسٹر اِن لاء، کا امتحان پاس کیا۔ میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ واپس آ کر کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر وکالت شروع کر دی۔

آپ بیک وقت ماہر قانون دان، سیاستدان، راہنما، عظیم فلسفی اور شاعر تھے۔ آپ کی وجہ شہرت آپ کی منفرد شاعری ہے۔ تاہم نثری تحریروں میں ان کے خطوط بھی بلند مرتبے کے حامل ہیں۔ دراصل ان کی ذات عظیم افکار و نظریات کا سرچشمہ تھی۔ انھوں نے ان افکار کا اظہار نظم و نثر دونوں میں کیا ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کریں۔

نثر میں ان کے خطبات، مقالات، دیباچوں، خطوط اور بیانات کو کتابی شکل دی گئی ہے اور ان کے خطوط کے بہت سے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ یہ خطوط علمیت، سچائی، بے ساختگی اور بے تکلفی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ خطوط مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام لکھے گئے ہیں۔ جن میں فلسفی، سیاستدان، ادیب، علماء، بزرگ اور دوست احباب شامل ہیں۔

ان کے خطوط کی زبان انتہائی سادہ، رواں اور روزمرہ ومحاورہ کے مطابق ہے۔ غالب کی طرح اقبال بھی اپنے خطوط میں آسان الفاظ والقاب وآداب استعمال کرتے ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں اس دور کے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، علمی وتمدنی اور اقبال کے ذاتی حالات کا ذکر ملتا ہے۔ اُنھوں نے ۱۹۳۸ء میں لاہور میں وفات پائی۔

مکاتیبِ اقبالؒ

(علامہ اقبالؒ)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو خطوط نگاری کے لوازمات سے متعارف کرانا۔
- طلبہ کو ڈاکٹر علامہ اقبال کی علمی اور فلسفیانہ طرزِ تحریر سے واقفیت دلانا۔
- مکاتیبِ اقبال کے ذریعے طلبہ کو عصرِ اقبال میں جاری علمی اور سیاسی رجحان سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو اُردو نثری ادب میں علامہ اقبال کا مقام بتانا۔

الفاظ و تراکیب

مخدوم الملک	سعادتِ حج	مخلصین	حقائقِ اسلام	جاہ و منصب
اطمینانِ قلب	بے فکر	نگہداشت	نشر و اشاعت	روحانیت

خط بنام مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ

جاوید منزل لاہور

۲۹ر مارچ ۱۹۳۷ء

مخدوم الملک جناب قبلہ پیر صاحب!

السلامُ علیکم! امید کہ میرا خط جو جمال الدین والی میں آپ سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ آپ کو مل گیا ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سفر میں صاحبزادہ بھی آپ کے شریکِ حال تھا۔ اس عمر میں سعادتِ حج نصیب ہونا اُس کی خوش نصیبی کی دلیل ہے۔

میں نے آپ کے مخلص کا خط پڑھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے احباب اور مخلصین آپ سے اس روحانیت کی بناء پر جو آپ نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پائی ہے۔ بہت بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں۔ ان اُمیدوں میں مَیں بھی شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت، حجت، اثر و رسوخ اور دولت وعظمت کو حقائقِ اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کریں۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جلد آپ کی طبیعت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو جس کی ابھی تک آپ کو توقع نہیں۔ افسوس ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے علمِ اسلام بلند کیا ان کی اولادیں دنیوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ کر تباہ ہوگئیں اور آج ان سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا۔ اِلَّا ماشاء اللہ! وقت تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں بزرگوں کی اولاد سے کسی کی روحانیت کو بیدار کر دے اور کلمہء اسلام کے اعلاء پر

ماموکرے۔ باقی اللہ کے فضل سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

میں آپ کے جانے سے چند روز بعد بیمار ہو گیا۔ یہاں تک کہ زندگی سے مایوسی تھی۔ دمے کے متواتر دورے ہوئے۔ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، گو دَمے میں بہت کچھ آفاقہ ہو گیا ہے۔

والسلام

مخلص

محمد اقبال

......☆......

خط بنام سر سید راس مسعود

لاہور

۸؍ جون ۱۹۳۷ء

ڈیئر مسعود!

تمہارا خط آج مل گیا ہے جسے پڑھ کر اطمینان ہوا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری بچی کو جلد صحت یاب کرے تا کہ تم دونوں کو اطمینانِ قلب حاصل ہو۔

جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے عام انتظام کے لیے جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے۔ میں نے فی الحال، آزمائشی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو جو اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اُردو بول سکتی ہے، بلوایا ہے۔

پروفیسر رشید صدیقی اور دیگر احباب نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہوگی تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔ جاوید کی عمر اس وقت قریباً تیرہ سال ہے اور منیرہ کی قریباً سات سال۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں، اسی واسطے میں نے مذکورہ بالا انتظام کیا ہے۔ یہ جرمن لیڈی، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن ہے جو ایک مدت سے علی گڑھ میں مقیم رہی ہے۔ شاید تم انھیں جانتے ہو گے۔ باقی تمہارے خط سے مجھے بے انتہا تسلی ہوتی ہے۔ اور تمہارا وعدہ بھی مجھ کو اچھی طرح یاد ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ گرمی شدید ہے علی بخش سلام کہتا ہے۔ جاوید سلام عرض کرتا ہے۔

ہاں، تم سن کر تعجب کرو گے کہ سر اکبر حیدری کا خط مجھ کو لندن سے مِلا ہے اور بہت دل خوش کن۔ والسلام

محمد اقبال

(مجموعہ مکاتیب اقبال)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) علامہ اقبال کی نظر میں حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سب سے بڑی خدمت کیا ہے؟

ب) علامہ اقبال کے مطابق ہندوستان میں علم اسلام بلند کرنے والے بزرگوں کی اولادیں کیوں تباہ ہو گئیں؟

ج) جرمن خاتون کی چند خوبیاں بیان کریں۔

د) جاوید اور منیرہ کی تربیت کے حوالے سے علامہ اقبال کیوں فکر مند تھے؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) مخدوم الملک پیر صاحب کے نام خط تحریر کیا گیا:

(i) ۸ جون ۱۹۳۷ء (ii) ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء

(iii) ۱۰ جون ۱۹۳۷ء (iv) ۴ دسمبر ۱۹۳۷ء

ب) علامہ اقبال مصنف مخدوم الملک کے بیٹے کی خوش نصیبی سمجھتا ہے۔

(i) سعادتِ حج (ii) والد کے احترام

(iii) بزرگوں کے احترام (iv) اسلام کی خدمت

ج) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے نصاب میں شامل دوسرا خط کس کے نام تحریر کیا ہے؟

(i) پروفیسر رشید احمد صدیقی (ii) سید سلیمان ندوی

(iii) مخدوم الملک پیر صاحب (iv) راس مسعود

د) راس مسعود کے نام مکتوب میں مصنف کو اطمینان ہوا تھا:

(i) بچی کی صحت یابی کا سن کر (ii) خط ملنے کا

(iii) جرمن خاتون کی دست یابی پر (iv) ان میں سے کوئی بھی نہیں

ہ) راس مسعود کے نام خط کے مطابق جرمن خاتون کا علی گڑھ کے پروفیسر سے رشتہ تھا:

(i) خالہ (ii) سالی

(iii) پھوپھی (iv) بہن

۳۔ نصاب میں شامل مکاتیب اقبال کی روشنی میں درست کی نشاندہی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال دمے کی وجہ سے بیمار تھے۔

ب) منیرہ کی عمر دس سال تھی۔

ج) سر راس مسعود نے جرمن خاتون کی شرافت کی بہت تعریف کی تھی۔

د) جرمن خاتون اسلامی معاشرت سے ناواقف تھیں۔

ہ) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کو سر حیدر اکبری کا خط لندن سے ملا تھا۔

۴۔ مکاتیب اقبال کی روشنی میں خالی جگہ پر کریں۔

الف) جاوید اقبال کی عمر .... برس تھی۔ (گیارہ ۔ تیرہ ۔ پندرہ)

ب) ڈاکٹر علامہ اقبال کی .... فوت ہوگئی تھیں۔ (بیوی ۔ والدہ ۔ بہن)

ج) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے سر راس مسعود کو خط .... ۱۹۳۷ء تحریر کیا تھا۔

(۲۹ مارچ ۔ ۸ جون ۔ ۱۰ جولائی)

د) جرمن خاتون ایک مدت سے .... میں مقیم تھیں۔ (علی گڑھ۔ لاہور۔ دہلی)

ہ) سر راس مسعود کے نام مکتوب میں لاہور میں موسم بہت .... تھا۔ (سرد۔ گرم۔ خوشگوار)

۵۔ سر راس مسعود کے نام مکتوب کی روشنی میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شخصیت کو آپ نے بحیثیت باپ کیسا پایا؟

۶۔ مخدوم الملک کے نام مکتوب کی روشنی میں ''علامہ محمد اقبال کا اسلام سے لگاؤ'' پر جامع نوٹ تحریر کریں۔

درخواست نگاری

درخواست کے لغوی معنی التماس، گزارش، عرضی، خواستگاری، آرزو یا تمنا کے ہیں۔ عرضی بھیجنے والے یا درخواست کرنے والے کو درخواست کنندہ یا درخواست دہندہ کہتے ہیں۔ دراصل عرضی یا درخواست وہ خط ہے جو کسی مقصد یا غرض کے لیے کسی افسر یا حاکم کی خدمت میں ارسال کیا جائے۔ درخواست لکھنے والا درخواست یا عرضی میں اپنی استدعا یا خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

سرگرمیاں

ا۔ اساتذہ کرام، طلبہ سے مختلف اخبارات اور جرائد میں خبروں، فیچروں، اداریوں، رپورٹوں، اشتہاروں اور خط بنام مدیر کو، ان میں پوشیدہ معنی اور معنی پر اثر انداز ہونے والے عناصر کے حوالے سے سمجھا کر پڑھوائیں۔

۲۔ طلبہ کو ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے چند دیگر خطوط بھی سنائیں۔

اشاراتِ سبق

ا۔ طلبہ کو علامہ محمد اقبال کی نثری طرزِ تحریر سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو اُردو ادب میں ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کی نثر کے حوالے سے ان کے مقام سے آگاہ کیا جائے۔

مست توکلی

(حالات زندگی)

مست توکلی ۱۸۳۱ء کو ضلع کوہلو میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق مری قبیلے کی لوہارانی شاخ سے تھا۔ نام سہراب خان رکھا گیا، اُس زمانے میں سرداروں کی بڑی عزت و تعظیم کی جاتی تھی۔ اتفاق سے سردار خاندان میں سہراب نام کے ایک سردار گزرے تھے۔ اس خیال سے کہ ایک عام آدمی کے بیٹے پر سردار کے نام کی وجہ سے ادب کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ لہٰذا نام بدل کر توکلی رکھ دیا گیا، اِن کا آبائی گاؤں مانٹرک ضلع کوہلو میں کاہان شہر سے شمال کی جانب واقع ہے۔ اُس زمانے میں مکتب، مدرسہ نہ تھا۔ عام بلوچ لڑکوں کی طرح ریوڑ چرانے لگے، مگر اُن کا دل اس کام میں نہ لگا، اکثر گم سم خیالوں میں غرق اور گہری سوچوں میں ڈوبے رہتے تھے۔ دیگر سات بھائی تھے باقی تمام بھائی وفات پا گئے۔

مست کے نام کا لاحقہ دو باتوں کی وجہ سے توکلی کا حصہ بنا۔ پہلی یہ کہ وہ مجذوب اور صوفی منش انسان تھے۔ دوسری بات یہ کہ توکلی ایک غزل گو شاعر تھے انھوں نے اپنی شاعرانہ ضرورت کے لیے ''مست'' کا لفظ بطور تخلص استعمال کیا۔ توکلی ایک بزرگ اور پہنچے ہوئے انسان تھے۔ اسی لئے کوہلو میں ان کے مزار پر ہر وقت لوگوں کا رش بندھا رہتا ہے۔ لوگ مرادیں لے کر ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔

مست توکلی کا تحریری تذکرہ سب سے پہلے ڈیمز نے اپنی کتاب ''پاپولر پوئیٹری آف بلوچیز'' میں کیا تھا۔ بعد میں ذکیہ سردار خان، میر مٹھا خان مری، ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اور غوث بخش صابر نے ان کی علمی و ادبی خدمات پر مضامین تحریر کیے۔ مگر بلوچی کے اِس عظیم شاعر پر بنیادی اور وسیع کام میر مٹھا خان مری کا ہے۔ جنھوں نے اِن کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر دو کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۹۶ء میں ان کا انتقال کوہلو میں ہوا۔

کلامِ مست توکلی

ترجمہ: ڈاکٹر شاہ محمد مری

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو صوفیانہ شاعری سے واقفیت دلانا۔
- ادب میں صوفی شعراء کے کلام کی اہمیت کے بارے میں بتانا۔
- بلوچستان میں صوفیانہ شاعری کی روایت بتانا۔
- مست توکلی کی صوفیانہ شاعری کی فنی خصوصیات سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔
- تراجم کی اہمیت بتانا۔

الفاظ و تراکیب

ساعت	سوکن	مجتمع	جھنکار	شبینہ
بیجی دریا	شبینہ	روضہ	بارش کے ریلے	دھماکہ خیز

ایک مختصر ساعت کے لیے لورالائی کی پشت پہ ٹھہرتے ہیں
شمس کے روضے پر، اور فقیر ڈھبہ پر جھنکار کرتے ہیں
شبینہ بجلیاں سلگتی ہیں، رخ کرتی ہیں کم آب علاقوں کی طرف
آدھی رات کو اپنی آمد کی خوشخبری والی مشعلیں جلاتی ہیں
ترخان پہ برستے ہیں، پیاسے پہاڑی دُنبوں کو پانی پلاتے ہیں
ماڑ کی شانک پر بارش کے ریلے اونٹوں جیسی قطاریں بناتے ہیں
سالو پر برستے ہیں، بارش کے ریلے کونج کی ڈاریں بنا کر
گھیرے میں لیتے ہیں دکی کو، ٹکڑی کے گڑھوں کو بھر دیتے ہیں
کوہِ کپڑی پہ بادل چھتری بن جاتے ہیں
(اڑتے پرندوں کی طرح) ایک پر جھکا دیتے ہیں اور ڈنئ دریا پر جا اترتے ہیں
طویل بیجی دریا نیم شب دھماکہ خیز ہو (طغیانی میں آئے)
دھند اور غبار میں گھنے بادلوں میں گھن گرج تھی
(بادل) باہم مجتمع ہو ہو کر پہاڑ پہ چڑھتے جاتے ہیں
چیٹیال کے بڑے سینگوں والے پہاڑی بکروں کی پیاس بجھاتے ہیں
سیمر کے خم دار سینگوں والے دنبے پیاسے ہو چکے ہیں

اور منتظر ہیں بادلوں بارشوں کے مناظر کے
بادل ساون میں شام کے وقت تشکیل پاتے ہیں
علاقوں کے علاقے چکر دار جھٹکے کھاتے ہوئے سرسبز وادیوں پہ قبضہ کر لیتے ہیں
برستے ہوئے آؤ تمہارے حتمی برسنے کی جگہ کا مجھے پتا ہے
(ہاں) آؤ تمہیں ماہ رخ کا مضبوط خیمہ دکھاؤں
رگر بند پہ برستے ہیں اور سنٹریں کے اس جانب برستے ہوئے
سمو کے پتھر سے بنے نقل مکانی کرنے سے پہلے کے گھروں پہ بار بار حملہ آور ہوں
برہنہ میدانوں کو شبینہ حملوں سے سیراب کر دیں
میں اُن سفید بادلوں سے تب خوش ہوں گا
جب وہ گرجتے ہوئے ڈائنٹر کے پہاڑ کا محاصرہ کر لیں
رسترانی پہاڑ کے دامن اور زرعی زمینیں سیراب کر دیں
ترژا کے پہاڑ پہ بادل سایہ فگن ہو جائیں
برس جائیں اور مست تالاب پہ بھیڑ کے بچوں کی پیاس بجھا دیں
کاہان شہر پہ ایک پوری رات مہمان بن جائیں
بانبور کے پہاڑ تک سارا علاقہ گھٹاؤں میں چھپ جائے
جب برسات کے بعد چراگاہ اگتی ہے
جئے ہو بارش کے قطروں کی آدھی راتوں کی میٹھی آہٹوں کی
بارش کا پانی خیموں کے اطراف میں خوبصورت آوازوں سے بہتا ہے
وہ ہاتھ ٹوٹ جائیں جو اس پانی کا راستہ (خیمے کے اندر جانے سے روکنے کے لیے) تبدیل کریں
بارشیں ضرور برسیں گی اور اس مجنوں (مست) کو خوش کر دیں گی
اور اس پالتو گھریلو لیموں جیسے زامر کی ٹہنی کو سیراب کریں گے

(مستیں توکلی۔ ترجمہ: ڈاکٹر شاہ محمد مری)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) شاعر لورالائی کی پشت پر بادلوں کو کیوں ٹھہرانا چاہتا تھا؟

ب) شاعر سفید بادلوں سے کب خوش ہوگا؟

ج) شاعر بارش برسنے سے کن جانوروں کی پیاس بجھانا چاہتا ہے؟

د) شاعر کے خیال میں بارش ہونے سے کون کونسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں؟

ہ) شاعر خیمے کے اندر پانی روکنے والے کو کیوں بددُعا دیتا ہے؟

و) آدھی رات کو بجلیاں اپنی آمد کی خبر کیوں دیتی ہیں؟

ز) مست توکلی نے اپنے کلام میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے اُن کے نام لکھیں۔

۲۔ مست توکلی کے کلام کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) مست توکلی کے کلام کے مترجم ہیں:

(i) گل خان نصیرؔ (ii) ڈاکٹر شاہ محمد مری

(iii) انور رومانؔ (iv) پروفیسر صاحبزادہ حمیداللہ

ب) مست توکلی زبان کے صوفی شاعر ہیں:

(i) بلوچی (ii) براہوی

(iii) پشتو (iv) سندھی

ج) شاعر سفید بادلوں سے خوش ہوگا جب وہ:

(i) برف برسا دیں (ii) پہاڑ کا محاصرہ کریں

(iii) بارش برسا دیں (iv) طوفان لائیں

د) جب بارشیں برستی ہیں تو خوش ہوتا ہے:

(i) مست توکلی (ii) مالدار لوگ

(iii) زمین (iv) غریب لوگ

۳۔ شاعر نے بادلوں کے گرجنے اور برسنے کی جو منظر کشی کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۴۔ مست توکلی کے کلام کے مطابق ذیل مصرعے مکمل کریں۔

الف) کوہ کپڑی پر بادل .... بن جاتے ہیں۔

ب) جب برسات کے بعد .... اُگتی ہے۔

ج) .... شہر پہ ایک پوری رات مہمان بن جائیں۔

د) برہنہ میدانوں کو شبینہ حملوں سے .... کر دیں۔

۵۔ نظم "کلام مست توکلی" کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۶۔ مست توکلی کے کلام کی روشنی میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں۔

نیم شب، طغیانی، آہٹ، سُلگی، روضہ، دھماکہ خیز

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے کالج میگزین یا کسی ادبی رسالے، ویب سائٹ میں اپنی اپنی تحریریں چھپوانے کے لیے اپنی یا دوسروں کی تحریریں مرتب کروائیں۔

۲) اساتذہ کرام طلبہ سے بلوچستان کے کسی اور صوفی شاعر کا کلام اُردو میں ترجمہ کروائیں۔

۳) اساتذہ کرام طلبہ سے نظم میں جن مقامات کے ناموں کا ذکر آیا ہے ان کی فہرست بنوائیں۔

۴) صوبہ بلوچستان کے کسی اور صوفی شاعر کے کلام سے انتخاب کر کے طلبہ ایک دوسرے کو سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اساتذہ طلبہ کو اُردو ادب میں تراجم کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

۲) اساتذہ طلبہ کو اُردو ادب میں صوفیانہ شاعری کی روایت بتائیں۔

۳) طلبہ کو بتادیں کہ صوفیانہ شاعری دراصل انسانیت کے گرد گھومتی ہے۔

۴) مست توکلی کی شاعری میں انسان دوستی کے پہلوؤں کو اُجاگر کریں۔

۵) مست توکلی کی شاعری کے فنی لوازمات سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

سید عابد شاہ عابدؔ

(حالاتِ زندگی)

سید عابد شاہ عابد نے ۱۹۳۷ء میں کوئٹہ میں ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد محکمہ پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ابتدائی تعلیم کوئٹہ سے حاصل کی۔ سید عابد شاہ عابد نے اپنے کیریئر کا آغاز سکول میں مدرس کی حیثیت سے کیا۔ بعدازاں یونیورسٹی آف بلوچستان کے شعبہ پشتو میں لیکچرر تعینات ہوئے اور ۱۹۹۷ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

سید عابد شاہ عابد نے اُردو اور پشتو زبانوں میں نظم ونثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے اُردو اور پشتو دونوں زبانوں میں ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں اور آج بھی پاکستان ٹیلی وژن سنٹر سے وابستہ ہیں اور شعبہ پشتو کے لیے بطور نیوز سپروائزر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ عابد شاہ عابد پشتو اکیڈمی، لوک ورثہ آف پاکستان، آغا حشر ڈرامیٹک سوسائٹی اور جمال الدین افغانی سوسائٹی سے بھی منسلک رہے۔

پشتو کلاسیک شاعر پیر محمد کاکڑ کے کلام کا اُردو ترجمہ کیا۔ پشتو فوک ادب کے معروف صنف ٹپہ کا اُردو ترجمہ، ''سیلاب'' اور ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ کے پشتو کلام کا اُردو ترجمہ ''خارِگل'' کے نام سے کیا۔ پشتو لوک کہانیوں کے مجموعہ ''اولسی نکلونہ'' کے مؤلف بھی ہیں۔

نیکی و بدی

(ترجمہ: پروفیسر سید عابد شاہ عابد)

مقاصد تدریس

- طلبہ کو لوک کہانیوں کی اہمیت بتانا۔
- لوک کہانی کے ذریعے طلبہ کے اخلاق سنوارنا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں لوک کہانیوں کے تراجم کی روایت سے آگاہ کرنا۔

الفاظ و تراکیب

ناخدا	سٹی پٹی	بھولا پن	مصر	تلاطم
خفتگانِ تہہ خاک	ناہنجار	عروس	تیکھی	حامی و ناصر

پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک بوڑھا اور ایک نوجوان یکجا سفر کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں نوجوان نے بوڑھے سے پوچھا "بابا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" بوڑھے نے جواب دیا: "میں شہر جا رہا ہوں اور وہاں سے گاؤں میں اپنی دُکان کے لیے کچھ سامان لانا چاہتا ہوں"۔ نوجوان سمجھ گیا کہ بوڑھے کے پاس یقیناً رقم موجود ہے۔ پھر بوڑھے نے نوجوان سے پوچھا۔ تم کیا کام کرتے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا، بابا! اس دنیا میں کوئی نیکی کی تلاش میں ہے اور کوئی بدی کے پیچھے سرگرداں ہے۔ میں بھی کسی کی تلاش میں ہوں۔ بوڑھے نے کہا کہ اے نوجوان! اگر تم نیکی کی تلاش میں ہو تو اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو اور اگر بدی کے پیچھے گھوم رہے ہو تو یاد رکھو، میں نے اپنی زندگی میں کافی نشیب و فراز کا سامنا کیا ہے۔ یہ داڑھی دھوپ میں سفید نہیں ہوئی ہے۔ دراصل بوڑھا اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر تم میرے خلاف کوئی ارادہ رکھتے ہو تو اس میں تم کامیاب نہیں ہو گے۔

نوجوان نے بوڑھے سے پوچھا کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرے تو؟ بوڑھے نے جواب دیا، پھر بھی اس کے بدلے نیکی کرو۔ کیونکہ بدی بدی سے ختم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ بدی کا خاتمہ نیکی سے ہی ممکن ہے اور ہر وہ شخص جو نیکی کرتا ہے کبھی نقصان نہیں اٹھاتا۔ نوجوان یہ سنتے ہی بوڑھے پر جھپٹ پڑا۔ اُسے خوب زدوکوب کر کے ساری رقم اُس سے چھین لی۔ بوڑھے نے کہا، اے نوجوان! اللہ تمھیں ذلیل و خوار کرے۔ آخر میں نے تمھارے ساتھ کونسی بدی کی تھی جو تم نے میری ساری رقم زبردستی چھین لی۔ نوجوان نے جواب دیا کہ نیکی کرنا ہے۔ بس اپنی نیکی یاد کرتے رہو۔ خدا حافظ۔

نوجوان چلا گیا۔ بوڑھا مار کھانے کے باعث چلنے کے قابل نہیں رہا۔ ادھر سورج غروب ہو رہا تھا۔ سوچا اندھیرا ہونے سے قبل کہیں پناہ لینی چاہئے۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ تو اُسے قریبی پہاڑ میں ایک غار دکھائی دیا۔ سوچا جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے رات اس غار میں گزار لیتا ہوں اور صبح واپس گھر کی راہ لونگا۔ وہ کسی طرح غار کے اندر

پہنچ گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بھیڑیا غار میں داخل ہوا۔ بوڑھا خوف کے مارے کونے میں خاموش پڑا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک لومڑی بھی غار میں داخل ہوئی اور اس کے بعد ایک خونخوار شیر غار میں پہنچا۔ بوڑھا خوف کے مارے پسینے میں شرابور تھا۔ مگر تینوں جانوروں کو بوڑھا نظر نہ آیا۔ شیر نے لومڑی سے انسانی زبان میں پوچھا کیا خبر لائے ہو؟ لومڑی نے جواب دیا کیا بتاؤں، صبح سے شہر کے قریب پہاڑی پر شکار کے انتظار میں بیٹھی رہی مگر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ شیر نے دریافت کیا کہ کیا کچھ کھایا پیا بھی یا پہاڑی پر بھوکی بیٹھی رہی؟ لومڑی نے ہنس کر کہا، نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ سارا دن اُس پہاڑی پر بیٹھ کر گزارا۔ جس میں سات بادشاہوں کا خزانہ دفن ہے۔ جب میں وہاں بیٹھتی ہوں تو بھوک اور پیاس ختم اور ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔

پھر شیر نے بھیڑیے کی جانب منہ موڑ کر پوچھا تم بتاؤ تم نے دن بھر میں کچھ شکار کیا یا نہیں؟ بھیڑیے نے جواب دیا کہ میں نے تو کسی بادشاہ کا خزانہ نہیں دیکھا۔ البتہ چند روز قبل ایک ریوڑ میں ایسا دنبہ دیکھا کہ اُس کی ایک ران ہم تینوں نہیں کھا سکتے۔ البتہ حکمت کی بات یہ ہے کہ اُس دنبے کا چمڑا سات امراض کی دوا ہے۔ مگر کیا کروں؟ ایک تو چرواہا بہت بیدار ہے اور دوم ایک خونخوار کتا ریوڑ کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے۔ صبح سے شام تک ریوڑ کے آس پاس رہتا ہوں مگر کام نہیں بنتا۔

بوڑھا جانوروں کی باتیں خاموشی سے بغور سنتا رہا۔ جانوروں کی باتیں سن کر وہ اپنی مار پیٹ کی تکلیف یکسر بھول گیا۔ اس کے بعد لومڑی نے شیر سے پوچھا۔ آپ اپنے بارے میں بتائیں۔ شیر نے کہا کہ اس پہاڑ کے دامن میں، میں نے ایک ایسا چشمہ تلاش کیا ہے کہ جس میں غسل کرنے کے بعد میری ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے اور میں تروتازہ ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد لومڑی نے کہا۔ چلو اب چلتے ہیں۔ ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ شاید باہر کوئی شکار مل جائے اور ہم اپنا پیٹ بھر سکیں۔ لہٰذا تینوں جانور غار سے باہر نکل گئے۔

بوڑھے نے دل میں سوچا کہ جانوروں کی باتیں بے بنیاد نہیں۔ صبح سب سے پہلے چشمہ پر پہنچ کر غسل کروں گا۔ جہاں ساری حقیقت کا پتا چل جائے گا۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی بوڑھا غار سے نکلا اور چشمے کی راہ لی۔ چشمے میں غسل کرنے کے بعد واقعی وہ نہ صرف تروتازہ ہوا بلکہ اس کی تمام تھکاوٹ، بھوک اور پیاس بجھ گئی۔ اب بوڑھے کو یقین ہوا کہ جانوروں کی بتائی ہوئی دوسری باتیں بھی درست ہیں۔ اب وہ گھر جانے کی بجائے شہر کی طرف روانہ ہوا تا کہ شہر کے قریب اُس پہاڑی کا جائزہ لے سکے جہاں سات بادشاہوں کا خزانہ دفن ہے۔ پہاڑی کے قریب پہنچتے ہی اُس نے دیکھا کہ بادشاہ کے سپاہی شاہی حکیم سمیت اعلان کر رہے ہیں کہ بادشاہ کی بیٹی شدید بیمار ہے۔ ملک کے تمام حکیم علاج کرتے

رہے مگر بے سود، اگر کوئی دانا حکیم آ کر بادشاہ کی بیٹی کا علاج کرے تو اُسے بڑا انعام دیا جائے گا۔

بوڑھا آگے بڑھا اور بادشاہ کی بیٹی کا علاج کرنے کی حامی بھری۔ شاہی حکیم نے بوڑھے سے پوچھا کیا واقعی تم علاج کر سکو گے؟ اگر ناکام رہے تو بادشاہ بڑا سخت مزاج آدمی ہے۔ ناکامی کی صورت میں تمہیں کہیں اس کے غضب کا نشانہ نہ بننا پڑے۔ بوڑھے نے کہا شفاء اللہ دیتا ہے آپ مجھے بادشاہ تک لے جائیں۔ جب بوڑھا بادشاہ کے محل پہنچا تو بادشاہ نے اُس سے کہا۔ دیکھ اے بوڑھے! میری بیٹی کے علاج میں بے شمار حکیم وطبیب ناکام ہوئے۔ اب میں مزید نیم حکیموں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ بادشاہ سلامت! آپ مجھے مریضہ کے پاس لے جائیں۔ باقی وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔ بوڑھے کو مریضہ کے کمرے میں لے جایا گیا۔ اُس نے مریضہ کو بغور دیکھا اور ماہر طبیب کی طرح بادشاہ سے مخاطب ہوا کہ میں آپ کی بیٹی کے مرض کو سمجھ چکا ہوں۔ میں علاج شروع کرتا ہوں۔ مگر مجھے چند سپاہی اور کچھ رقم درکار ہے۔ تاکہ اپنی پسند کا دنبہ لا سکوں۔ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ بوڑھے کو جس قدر سپاہیوں اور رقم کی ضرورت ہے دے دو۔

بوڑھا سپاہیوں سمیت بھیڑیے کے بتائے ہوئے ریوڑ کی تلاش میں نکلا۔ جلد ہی اُسے وہ ریوڑ اور بڑی جسامت والا دنبہ مل گیا۔ بوڑھے نے چرواہے سے کہا کہ اس دنبے کو کتنے میں بیچو گے؟ چرواہے نے بیچنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرے ریوڑ کا بادشاہ ہے۔ بوڑھے نے کہا کہ بادشاہ کی بیٹی شدید بیمار ہے۔ ہم نے یہ دنبہ اِسی مقصد کے لیے خریدنا ہے۔ اگر تم نہیں بیچو گے تو یہ سپاہی زبردستی لے جائیں گے اور تم ہاتھ ملتے رہو گے۔ چرواہے نے پوچھا۔ آپ کتنی رقم دینگے؟ بوڑھے نے کہا ایک ہزار روپے۔ چرواہا اتنی کثیر رقم کا سنکر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور رقم لیکر خوشی خوشی دنبہ بوڑھے کے حوالے کیا۔ بوڑھا دنبہ لیکر شاہی محل پہنچا اور دنبے کو ذبح کر کے اُس کی کھال اُتاری اور شہزادی کو پہنا کر کہا کہ وہ چوبیس گھنٹے تک یہ کھال پہنے رکھے۔ اگلے روز جب کھال اُتاری گئی تو شہزادی بالکل صحت یاب تھی۔ بادشاہ نے بوڑھے کو کثیر رقم دیکر پوچھا اور کیا مانگتے ہو۔ بوڑھے نے کہا کہ شہر کے قریب پہاڑی پر مجھے قلعہ بنانے کی اجازت دیں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔

بوڑھا بازار پہنچا اور کئی مستری اور مزدور ساتھ لیے اور پہاڑی پر قلعے کی تعمیر شروع کی۔ چند روز میں قلعے کی چار دیواری مکمل ہوئی تو بوڑھے نے مزدوروں کو فارغ کیا اور خود گینتی بیلچہ لیکر قلعہ کے اندر پہاڑی کی کھدائی کرنے لگا۔ صبح سے شام تک وہ تن تنہا کھدائی کرتا رہا۔ پانچویں روز اُسے خزانہ مل گیا۔ خزانہ پانے کے بعد اُس نے قلعے کے اندر کمرے تعمیر کیے اور تکمیل کے بعد گاؤں سے بیوی بچوں کو لا کر وہاں مستقل طور پر رہنے لگا۔ بوڑھا بڑا سخی تھا۔ ہر وقت اُس کے

ہاں مہمانوں خصوصاً غریبوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک روز وہی نوجوان جس نے بوڑھے کو زدوکوب کر کے رقم لوٹی تھی وہاں پہنچا۔ بوڑھے نے نوجوان کو پہچان لیا۔ مگر نوجوان اُسے نہ پہچان سکا۔ بوڑھا اُسے گھر لے گیا۔ جب نوجوان جانے لگا تو بوڑھے نے اُسے قیمتی جوڑا اور نقد رقم دی۔ جوان یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور پوچھا: بابا! تم میرے ساتھ یہ نیکی کیوں کر رہے ہو؟ بوڑھے نے جواب دیا کہ تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ بوڑھے نے ساری کہانی نوجوان کو سنائی۔

رخصت لینے کے بعد نوجوان سیدھا غار کی جانب روانہ ہوا تاکہ تینوں جانوروں کی باتیں سن کر وہ بھی مالا مال ہو جائے اور غار کے اندر بیٹھ کر جانوروں کا انتظار کرنے لگا۔ تینوں جانور حسبِ معمول سرِشام غار میں پہنچے۔ شیر نے بھیڑیے سے پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ بھیڑیے نے جواب دیا۔ اے جنگل کے بادشاہ! مجھے کئی دنوں سے وہ دنبہ ریوڑ میں چرتا نظر نہیں آیا۔ نجانے چرواہے نے اُسے فروخت کر دیا ہے یا مر چکا ہے؟ اس کے بعد شیر نے لومڑی سے دریافت کیا کہ تم اپنا حال سناؤ؟ لومڑی بولی، اے جنگل کے بادشاہ! وہ پہاڑی جس پر میں بیٹھتی تھی اور یوں میری ساری پیاس، بھوک اور تھکاوٹ ختم ہو جاتی تھی اب وہ میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ وہاں ایک شخص نے قلعہ نما مکان تعمیر کر لیا ہے۔ اب میں اُس کے قریب بھی نہیں جا سکتی۔

اس کے بعد لومڑی نے شیر سے کہا، آپ کے چشمے کا کیا حال ہے؟ شیر نے جواب دیا کہ میرے چشمے کے پانی کے اثرات ختم ہو چکے ہیں۔ پانی میں غسل کے باوجود پیاس، بھوک اور تھکاوٹ بدستور رہتی ہے۔ لومڑی نے کہا کہ اُس رات جب ہم ان تینوں چیزوں کی خوبیاں بیان کر رہے تھے شاید کوئی ہماری باتیں سن رہا تھا۔ آیئے آس پاس دیکھیں تاکہ پتا چل سکے۔ جب تینوں جانور غار میں مزید اندر گئے تو انھیں وہ نوجوان نظر آیا۔ تینوں نے مل کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور کھا گئے۔

(پشتو اولسی نکلونہ)

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) نوجوان نے بوڑھے پر کیوں حملہ کیا؟

ب) مار کھانے اور لُٹنے کے بعد بوڑھے نے رات کہاں اور کیسے گزاری؟

ج) بوڑھے نے پہاڑی میں دفن خزانہ کیوں کر حاصل کیا؟

د) تینوں جانوروں کو کس بات کا ملال تھا؟

ہ) نوجوان غار میں کس مقصد کے لیے چھپا رہا اور اُس کا انجام کیا ہوا؟

۲۔ ''بدی کا بدلہ بدی سے نہیں بلکہ بدی کا خاتمہ نیکی سے ممکن ہے'' وضاحت کریں۔

۳۔ آپ نے اس کہانی سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟

۴۔ کہانی کا خلاصہ تحریر کریں۔

۵۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) لوک کہانی ''نیکی و بدی'' کے مترجم ہیں:

(i) ڈاکٹر انعام الحق کوثر (ii) انور رومان

(iii) سید عابد شاہ عابد (iv) ڈاکٹر شاہ محمد مری

ب) لوک کہانی ''نیکی و بدی'' کے موضوع ہے:

(i) اخلاقی (ii) سماجی

(iii) معاشی (iv) مذہبی

ج) لوک کہانی ''نیکی و بدی'' زبان کے ادب سے لی گئی ہے:

(i) بلوچی (ii) پشتو

(iii) براہوئی (iv) سرائیکی

د) بوڑھا شخص بدی کا بدلہ دیتا ہے:

(i) نیکی سے (ii) بدی سے

(iii) دشمنی سے (iv) غیرت سے

ہ) نوجوان ایک آدمی تھا:

(i) سخی (ii) لالچی

(iii) بزدل (iv) دلیر

۶۔ متن کے مطابق درست کی نشان دہی کی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) بوڑھے نے رات گزارنے کے لیے غار میں پناہ لی۔

ب) چشمے کے پانی میں غسل کرنے سے تھکاوٹ ختم ہو جاتی تھی۔

ج) بادشاہ کی بیٹی شاہی حکیم کے علاج سے صحت یاب ہو گئی۔

د) ایک ہزار روپے کا سن کر چرواہا بخوشی دنبہ فروخت کرنے پر راضی ہوا۔

ہ) لالچی نوجوان کا انجام اچھا نکلا۔

۷۔ بوڑھے اور نوجوان کے کرداروں کا موازنہ کریں۔

لوک کہانی

لوک کہانیاں کسی علاقے یا قوم کی روایتوں، گیتوں، کہانیوں اور نظموں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں میں بہادروں کے جری کارناموں اور خاندانی جھگڑوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان میں ہر طبقے کے انسانوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہانیاں ایک خاص کردار، خاکہ اور ماحول کو تخلیق کرتی ہیں یا پھر خاص واقعہ پر زور دیتی ہیں۔ ان میں صرف زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت اور مقصدیت کا بھی حسین امتزاج ہیں اور اس طرح یہ لوک کہانیاں ادب کے سماجی نصب العین کو پورا کرتی ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام، طلبہ کو کوئی اور لوک کہانی سنا کر انھیں طلبہ سے سُنیں۔

۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کو کسی کہانی کے جملے درمیان سے سنا کر اُن سے پورا مطلب اخذ کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام لوک کہانی ''نیکی و بدی'' کے ذریعے طلبہ کا اخلاق سنوارنے کی کوشش کریں۔

۲۔ طلبہ کو ادب میں لوک کہانیوں کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

۳۔ طلبہ کو تراجم کی اہمیت اور روایت پر لیکچر دیں۔

ماہر القادری

(حالاتِ زندگی)

ماہر القادری ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء کو موضع کسیر کلاں، ضلع بلند شہر (یو پی بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اِن کا اصل نام منظور حسین اور تخلص ماہر تھا۔ سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ماہر القادری کہلائے۔ والد بھی شاعر تھے اور ظریف تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۳۴ء میں روزنامہ "مدینہ" بجنور کے عملہ ادارت سے وابستہ ہوگئے۔ بچوں کے رسالے "غنچہ" کے بھی مدیر رہے۔ ۱۹۳۵ء میں عراق کا سفر کیا اور مقدس مقامات کی زیارت کی۔ آپ کچھ عرصہ ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستہ رہے اور کئی فلموں کے نغمے لکھے جو مقبول ہوئے۔ مگر یہ ماحول آپ کو راس نہ آیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی آگئے۔ یہاں سے ۱۹۴۹ء میں ماہنامہ "فاران" جاری کیا۔ علامہ خلیل عرب سے دو سال تک عربی ادب پڑھا۔ ۱۹۵۴ء میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۶۹ء میں جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی علمی اور دینی تنظیموں کی دعوت پر افریقہ کا سفر کیا۔

اگرچہ اُنھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ترانے اور گیت بھی لکھے لیکن ان کی اصل وجہِ شہرت نعت گوئی ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، سلاست، روانی اور فصاحت و بلاغت نمایاں ہے۔ ان کی نعت گوئی میں حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا احترام پیشِ نظر رہا ہے۔ ایک طرف حُسنِ عقیدت ہے تو دوسری طرف الفاظ کا پاکیزہ چناؤ۔ دونوں چیزوں نے انھیں نعت خوانی کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا ہے۔

آپ کی متعدد تصانیف میں سے چند اہم اور قابلِ ذکر یہ ہیں، ظہورِ قدسی، محسوساتِ ماہر، نغماتِ ماہر، جذباتِ ماہر، ذکرِ جمیل، حسن و شباب، نگینے، دُرِ یتیم، (سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم) کاروانِ حجاز، نقشِ توحید، قولِ فیصل، محبت بھرے خطوط۔

مئی ۱۹۷۸ء میں مشاعرے کے سلسلے میں سعودی عرب گئے اور مشاعرے میں شرکت سے پہلے ہی ۱۲ مئی کو انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

حمد

(ماہر القادری)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے محبت کا احساس پیدا کرنا۔
- ماہر القادری کے شعری محاسن سے طلبہ کو روشناس کرانا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں حمد گوئی کی روایت سے متعارف کرانا۔
- طلبہ کو مشتقات سے متعارف کرانا۔

الفاظ و تراکیب

کارساز	پردہ کشا	تسکین روح	جَل شانہٗ	موجِ نسیم
نغمہ سنج	مہر و ماہ	آبشار	آمرزگار	پردہ دار

خالق بھی، کار ساز بھی، پروردگار بھی
وہ جس کی ذات پردہ کُشا، پردہ دار بھی

ذکرِ خدائے پاک جو ہے جَل شانہٗ
تسکین روح بھی ہے، دلوں کا قرار بھی

سب ہیں اِسی کے حکم سے دن ہو کہ رات ہو
شام خزاں اِسی کی ہے، صبحِ بہار بھی

قدرت سے اِس کی گرم سفر ہیں یہ مہر و ماہ
موجِ نسیم بھی ہے رواں، آبشار بھی

وابستہ سب ہیں نظمِ قضا و قدر کے ساتھ
لیل و نہار بھی، روشن روز گار بھی

یاد خدا میں نغمہ سراء نغمۂ سنج ہیں
طاؤس بھی، ہزار بھی، صلصل بھی، سار بھی

مجھ سے گناہ گار کو بخشش کی ہے اُمید
اِس سے کہ جو کریم ہے آمرزگار بھی

(کلیاتِ ماہر)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر نے پردہ دار کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟

ب) حمد میں ردیف اور قافیہ کی نشان دہی کریں۔

ج) حمد میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کی کون کون سی صفات بیان کی ہیں؟

د) حمد کے آخری شعر میں شاعر نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے؟

۲۔ 'حمد' کے اشعار کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) حمد کے شاعر ہیں:

(i) حفیظ جالندھری (ii) مولانا ظفر علی خان

(iii) ماہر القادری (iv) مولانا حالی

ب) شاعر کو اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے:

(i) بخشش کی (ii) ترقی کی

(iii) شہرت کی (iv) ہمدردی کی

ج) ''یادِ خدا'' قواعد کی رو سے کیا ہے؟

(i) مرکب اضافی (ii) مرکب توصیفی

(iii) مرکب ظرفی (iv) مرکب عطفی

۳۔ اس 'حمد' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۴۔ درج ذیل تراکیب کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ مفہوم واضح ہو جائے۔

تسکینِ روح ۔ مہر و ماہ ۔ نغمہ سنج ۔ کارساز ۔ رواں آبشار ۔ قضا و قدر ۔ لیل و نہار

۵۔ ماہر القادری کے نعتیہ کلام کی روشنی میں اُن کے اشعار کے فنی محاسن بیان کریں۔

۶۔ 'حمد' کے اشعار کے مطابق مصرعے مکمل کریں۔

الف) شامِ خزاں اسی کی ہے ....

ب) موجِ نسیم بھی ہے ....

ج) یادِ خدا میں نغمہ سراء ....

د) طاؤس بھی ہزار بھی ....

ہ) لیل و نہار بھی ....

مشتقات

مشتقات، مشتق کی جمع ہے۔ مشتق کا مطلب نکلا ہوا۔ اسم مشتق وہ اسم ہے جو خود تو کسی مصدر سے نکلا ہو۔ لیکن اس سے مزید کوئی کلمہ نہ نکل سکے۔ مثلاً لکھنے سے لکھنے والا، لکھائی۔ جانا سے جانے والا۔ سینا سے سینے والا، سلائی۔ پڑھنا سے پڑھنے والا، پڑھائی، پڑھوائی۔

اسم مشتق کی پانچ اقسام ہیں:

۱۔ اسم فاعل: وہ اسم مشتق ہے جو مصدر سے نکلتا ہے۔ جو کام کرنے والے شخص یا چیز کو ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ اسم مفعول: وہ اسم مشتق ہے جو مصدر سے نکلتا ہے اور اُس شخص یا چیز کی طرف اشارے کرے جس پر کوئی فعل واقع ہوا ہو۔

۳۔ اسم حاصل مصدر: وہ اسم مشتق ہے جو مصدر تو نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں کسی مصدر کی کیفیت۔ حالت اور اثر پایا جائے۔ مثلاً مارنا سے مار۔ تولنا سے تول۔

۴۔ اسم معاوضہ: وہ اسم مشتق ہے جو کسی کام کی اُجرت یا معاوضے کو ظاہر کرے اور معنی دے مثلاً رنگنا سے رنگائی، سینا سے سلائی۔ پکوانا سے پکوائی۔

۵۔ اسم حالیہ: وہ اسم مشتق ہے جو فاعل یا مفعول یا کسی اور اسم کی حالت یا کیفیت بیان کرے۔ مثلاً اکبر روتا ہوا گیا۔ اسلم پڑھتے پڑھتے سو گیا۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے لغت کو اشتقاق، مشتقات کے حوالے سے استعمال کروائیں۔
۲) اساتذہ کرام طلبہ کو لائبریری میں سے حمدیہ کلام کے مجموعوں کے انتخاب میں مدد دیں تاکہ ان کے ذوقِ مطالعہ میں اضافہ ہو۔
۳) اُستاد طلبہ سے حمدیہ اشعار پر مشتمل کتابچہ بنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اُستاد طلبہ کو بتائیں کہ ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو حمد کہلاتی ہے۔
۲) اساتذہ طلبہ کو ماہر القادری کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ کریں۔
۳) طلبہ کو اُردو ادب میں حمدیہ شاعری کی روایت سے آگاہ کریں۔
۴) طلبہ کو بتائیں کہ یہ حمد، غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

محسن کاکوروی

(حالاتِ زندگی)

محمد محسن نام، محسن تخلص، ۱۸۲۷ء میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ محسن کی تعلیم بچپن میں قدیم طرز پر ہوئی۔ بعد میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ عدالت میں عہدہ نظارت پر فائز رہے۔ مگر جلد ہی ملازمت چھوڑ کر وکالت کا امتحان پاس کیا اور آگرہ میں پریکٹس کرنے لگے۔ ان کی قانونی لیاقت سے متاثر ہو کر حکام نے انھیں جج بنانا چاہا مگر انھوں نے آزاد رہنا پسند کرتے ہوئے یہ پیشکش منظور نہ کی۔ غدر کے ہنگامے کے بعد آگرہ چھوڑ کر مین پوری (بھارت) چلے گئے اور وفات تک وہیں رہے۔ اُنھوں نے نو سال کی عمر میں فریضہ حج ادا کیا۔

محسن کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ شروع میں اپنا کلام اصلاح کے واسطے مولوی ہادی علی اشکؔ کو دکھاتے رہے مگر جلد ہی اصلاح کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ابتداء میں لکھنؤی فضا اور عام رنگ شاعری سے متاثر ہو کر غزلیں کہتے رہے۔ مگر جلد ہی ان کے مذہبی رجحان اور فطری سلاست روی نے انھیں غزل گوئی کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے نعت گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ یوں تو محسن سے پہلے بہت سے شاعروں نے نعت گوئی کی تھی مگر اس کے باوجود ان کے امتیاز و افتخار کی دو اہم وجوہات ہیں۔ اوّل اس سے پہلے کسی شاعر نے نعت گوئی کو اپنا مسلک شعری نہیں بنایا تھا۔ دوم انھوں نے اس میں ایک مخصوص تخلیقی شان پیدا کی۔ موضوع کے اعتبار سے انھوں نے نعتیہ مضامین میں بڑی جدّت سے کام لیا ہے اور صحیح اسلامی عقائد اور تصورات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیوند کیا ہے کہ دل وجد کرنے لگتا ہے۔

محسن کی شاعری مجموعی طور پر زبان دانی کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کی نعتوں میں صداقت اور خلوص موجود ہے۔ ان کا اسلوب شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ دبستان لکھنؤ سے تعلق کی وجہ سے ان کے ہاں شوکت الفاظ پائی جاتی ہے ان کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے۔ نادر و حسین تشبیہات و استعارات کے استعمال نے ان کے کلام کو چار چاند لگا دیئے۔

ان کے کلام کا اصل سرمایہ ان کی نعت گوئی ہے مگر نعتیہ کلام کے علاوہ ان کے سرمایے میں چند غزلیں، ایک ناتمام عشقیہ مثنوی ''نگارستانِ اُلفت''، ایک مثنوی ''فغانِ محسن'' اور ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی شان میں اور چند قطعات، تاریخ و رباعیات ہیں۔

۱۹۰۵ء کو آپ کا انتقال مین پوری (بھارت) میں ہوا۔

نعت

(محسن کاکوروی)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو نعت کے مفہوم سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم سے محبت کے جذبات اُبھارنا۔
- طلبہ کو محسن کاکوروی کی شاعرانہ عظمت سے روشناس کرانا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں نعتیہ شاعری کی روایت سے آگاہ کرنا۔
- صفت کی اقسام سے روشناس کرانا۔

الفاظ و تراکیب

سخن	ازل	درود	خواندہ	مہماں
منزلِ توحید	عرشِ بریں	بیاں	لامکاں	شبِ معراج

سُخن کو رُتبہ ملا ہے مری زباں کے لیے
زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لیے

ترے ﷺ زمانے کے باعث زمیں کی رونق ہے
مِلا زمیں کو رتبہ ترے ﷺ زباں کے لیے

ازل میں چن لیے خالق نے رنگ رنگ درود
بجائے لعل و گہر، تیرے ﷺ ارمغاں کے لیے

لکھا قلم نے یہ پڑھ کر درود کُرسی پر
بچھی رہے یہ کسی خواندہ مہماں کے لیے

چمک گئی تیرے ﷺ یاروں سے منزلِ توحید
یہ چار اِک بنائے ہیں لامکاں کے لیے

تھی خوش نصیبی عرشِ بریں شبِ معراج
کہ بنے سراپا قدم شاہِ ﷺ مرسلاں کے لیے

نزول نسخۂ پاکیزۂ کلام مجید
ترے عُروج، ترے ﷺ عہد کے بیاں کے لیے

خدا کے سامنے محسن پڑھوں گا وصف نبی ﷺ
سجے ہیں جھاڑ یہ باتوں کے، لامکاں کے لیے

(انتخاب نعت از عبدالغفور قمر)

مشق

۱۔ مندرجہ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر لعل و گہر کو کن معنوں میں استعمال کرتا ہے؟

ب) شاعر لامکاں سے کیا مراد لیتا ہے؟

ج) عرشِ بریں کی خوش نصیبی کیا تھی؟

د) نعت میں کم از کم پانچ مرکبات کی نشاندہی کریں۔

ہ) نعت کے پہلے شعر کے مصرعوں کے درمیان تعلق کی وضاحت کریں۔

۲۔ پانچویں شعر میں ''یاروں'' اور ''چار اکے'' سے شاعر کیا مراد لینا چاہتا ہے؟

۳۔ نعت کے اشعار کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) اس نعت کے شاعر ہیں:

(i) محسن کاکوروی (ii) ماہر القادری

(iii) الطاف حسین حالی (iv) حفیظ جالندھری

ب) متن کے مطابق شاعر خدا کے سامنے پڑھے گا۔

(i) وصفِ نبیؐ (ii) کلمہ شہادت

(iii) کلمہ توحید (iv) وصفِ صحابہ کرامؓ

ج) نعت میں تعریف بیان کی جاتی ہے:

(i) اللہ تعالیٰ کی (ii) حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی

(iii) صحابہ کرامؓ کی (iv) اولیاء کرام کی

۴۔ نصاب میں شامل نعت کا مرکزی خیال لکھیں۔

۵۔ درج ذیل تراکیب کے معنی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

شبِ معراج ۔ عرشِ بریں۔ نسخہ پاکیزہ ۔ لامکاں ۔ منزلِ توحید

وصفی یا اسمِ صفت

وصفی سے مراد تعریفی۔ صفاتی یا توصیفی ہے جو صفت سے نکلا ہے۔ یعنی وہ اسم جو کسی دوسرے اسم کی اچھائی، بُرائی، مقدار، حالت اور تعداد کو ظاہر کرے اور اُس چیز میں یہ صفت مستقل طور پر پائی جائے اور جس چیز یا شخص کی اچھائی یا بُرائی بیان کی جائے اُسے موصوف کہتے ہیں۔ مثلاً اونچا، نیچا، بڑا، چھوٹا، بہادر، بزدل، سچا، جھوٹا، خوب صورت، بدشکل، میٹھا، کڑوا وغیرہ۔ اگر اسمِ صفت اور اسمِ موصوف ملا کر لکھیں تو اُسے مرکب توصیفی کہتے ہیں۔ مثلاً سیاہ ٹوپی، نیلا آسمان، گرم چائے وغیرہ۔

اقسام: وصفی یا صفت کی پانچ اقسام ہیں: ذاتی، ضمیری، عددی، نسبتی، مقداری۔

۱۔ صفت ذاتی: یہ ایسی صفت ہے جو اپنے موصوف کی ذاتی خصوصیات بیان کرے۔ مثلاً دانا، نیک، شریف، دولت مند، سخی وغیرہ۔

۲۔ صفت ضمیری: وہ اسم جو دراصل ضمیر ہو اور اس کے ساتھ وہ صفت کے معنی بھی دیتا ہو۔ مثلاً چند، کئی ہر، سب، ایسا، جیسے وغیرہ۔

۳۔ صفت عددی: وہ اسم صفت ہے جو کسی اسم کی ٹھیک تعداد یعنی گنتی ظاہر کرے۔ مثلاً پانچ کرسیاں، آٹھ کتابیں، تین آدمی، سات کیلے وغیرہ۔

۴۔ صفت نسبتی: وہ اسم صفت ہے جس میں کسی دوسری چیز سے کسی نہ کسی طرح تعلق، گہرا واسطہ، لگاؤ اور نسبت پائی جائے۔ مثلاً پاکستان سے پاکستانی، لاہور سے لاہوری، پشاور سے پشاوری، ایران سے ایرانی، کاکوری سے کارکوروی وغیرہ۔

۵۔ صفت مقداری: ایسے تمام الفاظ جو کسی چیز کی مقدار یا جسامت کو ظاہر کرے مثلاً پانی کافی ٹھنڈا ہے، یہ سیب بہت میٹھا ہے، وہ کیسا ہوشیار لڑکا ہے، اکبر بہت موٹا ہے۔ ان جملوں میں بہت، کیسا، کافی کے الفاظ صفتِ مقداری ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو وصفی ولغوی معنی کے لحاظ سے نعت کا استعمال کروائیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کے درمیان کسی تحریر پر استحسانی انداز میں گفتگو کروائیں۔
۳۔ مذکورہ نعت کو طلبہ سے ترنم کے ساتھ پڑھنے کا کہا جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو اُردو میں نعت گوئی کی روایت سے آگاہ کریں۔
۲۔ اساتذہ طلبہ کو اُردو ادب میں محسن کاکوروی کے مقام بحیثیت نعت گو شاعر سے آگاہ کریں۔

نظیر اکبرآبادی

(حالاتِ زندگی)

نظیر کا اصل نام ولی محمد ہے۔ آپ ۱۷۳۵ء میں دِلی میں پیدا ہوئے چونکہ عمر کا زیادہ حصہ اکبرآباد میں گزارا' اس لیے اپنے نام کے ساتھ اکبرآبادی لکھتے تھے۔ بارہ بھائیوں میں صرف نظیر زندہ بچے۔ اس لیے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھے۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچے اور تاج محل کے قریب مکان میں رہنے لگے۔ نظیر کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ تاہم وہ عربی' فارسی' ہندی اور ہندوستان کی کئی دوسری زبانیں جانتے تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا۔ اسی مزاج کی وجہ سے وہ درباروں سے دور رہے۔ نواب سعادت علی خان نے انھیں لکھنؤ بُلوایا' وہ نہ گئے۔ اسی طرح بھرت پور کے رئیس کی دعوت بھی ٹھکرادی۔ متھرا میں کچھ عرصہ معلّم رہے مگر جلد ہی نوکری چھوڑ کر آگرہ آگئے اور سترہ روپے ماہوار پر لالہ بلاس رام کے بچوں کے اتالیق ہوگئے۔

نظیر اکبرآبادی نے میرؔ، سوداؔ' ناسخؔ و آتشؔ اور انشاؔء و جرأتؔ کا زمانہ دیکھا' مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث سب سے الگ رہے۔ اُن کی شاعری عوامی ہے۔ انھوں نے اپنے قرب و جوار کے ماحول' اپنے عہد کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کو بڑی عمدگی کے ساتھ اپنی شاعری میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے شعر وسخن کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا تعلق براہِ راست عوام الناس' بالخصوص غریب اور مفلس طبقے سے تھا۔ ان کی نظموں میں مناظرِ فطرت' مذہبی تہوار' سماجی رسوم' میلوں ٹھیلوں' جانوروں حتیٰ کہ پھلوں اور سبزیوں کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے اُردو نظم گوئی کے دامن کو وسیع کیا۔

انھوں نے طویل اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ مناظرِ فطرت' موسموں اور تہواروں پر ان کی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں ان کے غیر معمولی مشاہدے اور زندگی کے گہرے تجربوں کی عکاس ہیں۔ نظیر کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ "کلیاتِ نظیر" اُردو ادب میں اہمیت کی حامل ہے۔ نظیر نے طویل عمر پائی۔ آخری عمر میں فالج کے عارضے میں مبتلا ہوئے اور اسی بیماری کے باعث ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا۔

انجام

(نظیر اکبر آبادی)

مقاصدِ تدریس

- اُردو شاعری میں صنف "نظم" کی ہیئت سے آگاہ کرنا۔
- نظم کی ہیئت "مسدس" سے متعارف کرانا۔
- اُردو نظم گوئی میں نظیر اکبر آبادی کے اندازِ بیان سے روشناس کروانا۔
- نیچرل شاعری کے نقطۂ آغاز کے بارے میں بتانا۔

الفاظ و تراکیب

بٹ	اجل	تن سوکھا	کبڑی	نقارا
دان	شکھ	زین دھرو	سر دُھنا	کھیپ

بٹ مار اجل کا آ پہنچا ٹک اُس کو دیکھ ڈرو بابا
دل ہاتھ اُٹھا اِس جینے سے، بے بس، جی مار مرو بابا
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
اب موت نقارا باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

☆

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ یا خاصہ حلوہ دان کرو
تن سوکھا کُبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
خیرات کرو، احسان کرو، یا پُن کرو یا دان کرو
کچھ لطف نہیں اِس جینے کا اب مرنے کا سامان کرو
اب موت نقارا باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

☆

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے
اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھ جاؤ گے
تن سوکھا کُبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سُکھ سے کھاؤ گے
کچھ بات نہیں بن آنے کی، گھبراؤ گے پچھتاؤ گے
اب موت نقارا باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

☆

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چنتی ہے
تم گٹھڑی باندھ کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دُھنتی ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات وہ لکڑی گُھنتی ہے
اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بُنتی ہے
اب موت نقارا باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

☆

بیوپار تو یاں کا بہت کیا اب واں کا بھی کچھ سودا لو
اُس راہ میں جو کچھ کھاتے ہیں، اُس کھانے کو بھی منگوالو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

جو کھیپ اُدھر کو چڑھتی ہے اِس کھیپ کو یاں سے لدوالو
سب ساتھی پہنچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستہ لو
اب موت نقارا باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

(کلیاتِ نظیرؔ)

مشق

۱) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر اشک بہانے کا مشورہ کیوں دیتے ہیں؟
ب) ''چلنے کی فکر کرو'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
ج) چوتھے بند میں شاعر نے عمر کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟
د) اب اپنی خاطر رونے سے کیا مراد ہے؟
ہ) گھوڑے پر زین دھرنے سے کیا مراد ہے؟
و) ''مرنے کو مہمان کرو'' کا کیا مطلب ہے؟
ز) بقول شاعر اچھے عمل کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

۲) نظم ''انجام'' کے اشعار کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) نظم ''انجام'' کا شاعر ہے۔
(i) اکبرالہ آبادی (ii) نظیراکبرآبادی
(iii) حفیظ جالندھری (iv) میرانیس

ب) نظم ''انجام'' ہیت میں لکھی گئی ہے۔
(i) مسدس (ii) مخمس
(iii) رباعی (iv) مثنوی

ج) مسدس کے ہر بند کے آخر میں جو شعر بار بار دہرایا جائے اُسے کہتے ہیں:
(i) مقطع (ii) مطلع
(iii) ٹیپ کا شعر (iv) تلمیح

۳) نظم ''انجام'' کے مطابق ذیل اشعار مکمل کریں

الف) تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

....

ب) اور ایسی دولت چھوڑ تم جو خالی ہاتھ جاؤ گے

....

ج) ....

کچھ لطف نہیں اس جینے کا اب مرنے کا سامان کرو

د) ....

کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے

ہ) اُس راہ میں جو کچھ کھاتے تھے اُس کھانے کو بھی منگوالو

....

۴) تیسرے بند کی تشریح کریں۔

۵) نظم ''انجام'' پڑھنے سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

۶) نظم ''انجام'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۷) نظم ''انجام'' میں جن صفتوں کا استعمال ہوا ہے۔ ان کی نشاندہی کریں۔

۸) نظیر اکبرآبادی کے ''اسلوبِ سخن'' کی خوبیوں کا جائزہ اُن کی نظمیہ کلام کی روشنی میں لیں۔

نظم:...... نظم ایک موضوع پر مربوط خیالات کا ایک مترنم اظہار ہے۔ جس میں خاص انداز یا ہیت کی پابندی ضروری نہیں۔ اِس کے ہر شعر کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔ اس کا ہر شعر دوسرے شعر سے زنجیر کی کڑی کی طرح مربوط ہوتا ہے۔ نظم میں میدان بھی وسیع ہوتا ہے۔ اور فنی لوازمات کی قید بھی کم ہوتی ہے۔ ردیف کے مشکل التزام سے بھی شاعر آزاد ہوتا ہے۔

مسدس:...... وہ نظم جس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہو۔

ٹیپ کا مصرع:...... کسی بھی ہیئت میں لکھی گئی نظم کے ہر بند کے آخر میں مسلسل دہرایا جانے والا مصرعہ یا شعر ٹیپ کا مصرع یا شعر کہلاتا ہے۔

سرگرمیاں

۱) طلبہ کے درمیان کسی بھی علمی موضوع پر مباحثہ/ مذاکرہ کروائیں اور اُستاد انھیں اُن کے آداب بھی بتائیں۔
۲) کلیاتِ نظیر سے طلبہ کو دیگر نظمیں سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو نظم کی ہیت اور اقسام کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔
۲) اُردو ادب میں نظم گوئی کی روایت سے آگاہ کریں۔
۳) نظیر اکبر آبادی کے "اسلوبِ سخن" کی خوبیوں پر سیر حاصل لیکچر دیں۔

میر حسن

(حالاتِ زندگی)

میر غلام حسن نام اور حسن تخلص۔ مشہور ہجو گو میر غلام حسن ضاحک کے صاحب زادے اور میر انیس کے دادا تھے۔ جدِ امجد ہرات سے دہلی میں آکر آباد ہوئے جہاں ۱۷۳۶ء میں میر حسن پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ دہلی ویران ہوئی تو والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے جو اُس زمانے میں اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں نواب سالار جنگ کی ملازمت اختیار کی۔ جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے دارالحکومت لکھنؤ منتقل کیا تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔

شاعری میر حسن کو وراثت میں ملی تھی۔ ابتداء میں اپنے والد سے پھر میر دردؔ سے صلاح لیتے رہے۔ ان کی شہرت کی وجہ غزل اور قصیدہ نہیں بلکہ مثنوی نگاری ہے اور یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اُن کی وجہ شہرت اُن کی مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ یہ مثنوی ایک منظوم داستان ہے جس میں بدرِ منیر اور شہزادی بے نظیر کا فسانہ عشق بیان کیا گیا ہے۔

میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کی زبان سادہ، رواں، بے ساختہ اور عام فہم ہے۔ ڈھائی سو برس گزر جانے کے باوجود اس کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس کی زبان آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ یہ مثنوی آج بھی اُسی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے جس دلچسپی سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ جذبات نگاری میں میر حسن کو بڑا ملکہ حاصل ہے بڑے، بوڑھے، عورت، مرد، بادشاہ، فقیر، امیر، غریب ہر شخص کے جذبات، خیالات اِس کی عُمر اور کے مرتبے کے لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں۔ مثنوی میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ منظر کشی میں میر حسن کو پورا عبور حاصل ہے وہ جس منظر کو پیش کرتے ہیں اس کی تمام ضروری جزئیات کو بڑی خوبصورتی سے سامنے لاتے ہیں۔

میر حسن کا اندازِ بیان بے تکلف ہے۔ وہ تشبیہہ اور استعارہ کو اپنے شعروں کی خوب صورتی اور دل کشی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہات بہت خوب صورت اور برمحل ہوتی ہیں۔ وہ مثنوی کو اس تسلسل اور ربط سے پیش کرتے ہیں کہ قلم کی روانی کہیں رکاوٹ محسوس نہیں کرتی۔ واقعات کی ترتیب اور تسلسل اس طرح سے پیوست ہیں کہ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ انھوں نے ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

داستان۔ تیاری میں باغ کی

(میر حسن)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو نظم کی صنف 'مثنوی' سے متعارف کروانا۔
- طلبہ کو منظر نگاری اور فطرت پرستی سے روشناس کرانا۔
- طلبہ کو میر حسن کی مثنوی نگاری کے فنی اسلوب سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں مثنوی نگاری کی روایت بتانا۔

الفاظ و تراکیب

مئے ارغوانی	ساقیا	لغلغے	مشام	چوپڑ
چھپر کھٹ	دروں	زرنگار	خیابان	لب جو

مئے ارغوانی پلا ساقیا! — کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا
دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چقیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا — کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال — نگہ کو وہاں سے گزرنا محال
سنہری مُغَرّق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
دیے ہر طرف آئینے جو لگا — گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں لغلغے اس میں روشن مَدام — معطر شب و روز جس سے مشام
چھپر کھٹ مُرَصَّع کا دالان میں — چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں
زمین پر تھی اس طور اس کی جھمک — ستاروں کی جیسے فلک پر چمک
زمیں کا کروں واں کی کیا میں بیاں — کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگِ مرمر سے چوپڑ کی نہر — گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اس کے سروِ سہی
کچھ اک دور دور اُس سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیتِ دار و بست
لگائے رہیں تاک واں مئے پرست

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان
مدن بان کی اور ہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار

پڑی آبِ جُو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

لیے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
پنیری جما دیں کہیں کھود کر

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال

لبِ جُو پہ آئینے میں دیکھ قد
اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ تد

خراماں صبا صحن میں چار سو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو

صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

چمن آتش گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

ہوا اِن گلوں سے دوبالا سماں
اِسی باغ میں تھا وہ سرو رواں

(مثنوی سحرالبیان)

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

(الف) نظم کے چھٹے شعر میں شاعر کے خیال کے مطابق وہاں نگاہ کا گزرنا کیوں محال تھا؟

(ب) دالان میں چھپر کھٹ کیوں چمکتا تھا؟

(ج) زمین کو کس قرینے سے سجایا گیا تھا؟

(د) میر حسن کی یہ نظم اُن کی کس مشہور مثنوی سے لی گئی ہے؟

(ہ) فلک پر کس چیز کی چمک نظر آ رہی تھی؟

(و) دروں پر کس چیز کے سائباں لگے ہوئے ہیں؟

(ز) پائے ہوس کس وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے؟

۲۔ نظم 'داستان باغ کی تیاری' [illegible] بیان کریں۔

تشبیہ:۔ تشبیہ کے لفظی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینا یا مثال دینا۔ اور علم بیان کی رو سے ایک چیز کو کسی مشترک خوبی کی بنا پر دوسری چیز کے مانند قرار دیا جائے۔ جبکہ وہ خوبی دوسری چیز میں زیادہ پائی جاتی ہو تو اِسے تشبیہ کہتے ہیں۔ مثلاً بچہ چاند کی طرح خوبصورت ہے۔

اس فقرے میں بچے کی خوبصورتی کو چاند سے تشبیہ دیکر اس کے حسن کو ظاہر کیا گیا ہے چونکہ چاند حسن کے لحاظ سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ لہٰذا بچے کی خوبصورتی کو چاند کی مانند قرار دیا گیا ہے۔

ارکانِ تشبیہ:۔ تشبیہ کے پانچ ارکان ہیں:

مشبہ، مشبہ بہ، حروفِ تشبیہ، وجہ شبہ، غرضِ تشبیہ

استعارہ:۔ استعارہ کے لفظی معنی ادھار لینے کے ہیں۔ علم بیان کی رو سے جب کوئی لفظ اصل کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں کا تعلق تشبیہ کا ہو تو اِسے استعارہ کہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ تشبیہ میں جو بات مشبہ میں ہوتی ہے اس کا ذکر استعارہ میں نہیں ہوتا۔ لیکن استعارہ میں مشبہ بہ کو مشبہ مان لیا جاتا ہے۔ مثلاً جاؤ! اُس اُلو کو بلا لاؤ۔

اس فقرے میں اُلو کے اصلی معنی مراد نہیں لئے گئے بلکہ اُلو ایک بیوقوف جانور ہے لہٰذا ایک احمق انسان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔

ارکانِ استعارہ:۔ ا۔ مستعارلہ، ۲۔ مستعارمنہ، ۳۔ وجہ جامع

مجازِ مرسل:۔ وہ لفظ جس کے مجازی معنی مراد ہوں مگر حقیقی اور مرادی معنوں میں تشبیہہ کا تعلق نہ ہو۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں: (۱) جز کہہ کر کل مراد لینا۔ (۲) کل کہہ کر جز مراد لینا، (۳) سبب بول کر نتیجہ مراد لینا، (۴) مسبب کہہ کر سبب مراد لینا۔

۳۔ نظم ''داستان باغ کی تیاری میں'' جو منظر کشی کی گئی ہے۔ اِسے مختصر الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھ کر جملوں میں استعمال کریں۔

محال۔ ہوس۔ فلک۔ عیاں۔ آن۔ اٹکا۔ سماں۔ قرینہ۔ داستان

۵۔ اس نظم میں کم از کم پانچ تشبیہات کی نشاندہی کریں۔

مثنوی

مثنوی میں طویل قصوں، داستانوں، کہانیوں، جنگ و جدل کے واقعات اور لوک کہانیوں کو منظوم صورت میں پیش کیا جاتا ہے یہ اپنی وسعت کی بناء پر ہر قسم کے مضمون کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اِس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کے بعد قافیہ بدل دیا جاتا ہے اس کے لیے مخصوص بحریں استعمال کی جاتی ہیں۔

سرگرمیاں

ا۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی ادب پارے کا علم بیان کی روشنی میں جائزہ لیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مجازی معنی کے لحاظ سے لغت کا استعمال کروائیں۔
۳۔ اُستاد طلبہ کو کسی اور شاعر کی مثنوی سُنائیں جسے طلبہ اپنی کاپیوں میں نوٹ کریں۔

اشاراتِ سبق

۱) طلبہ کو مثنوی کی ہیئت بتائی جائے۔
۲) بہار کے منظر پر طلبہ کو کوئی نظم سنا کر درج بالا نظم سے اس کا موازنہ کیا جائے۔
۳) طلبہ کو میر حسن کی نظم گوئی کی خوبیوں سے آگاہ کیا جائے۔
۴) طلبہ کو اُردو ادب میں مثنوی کی روایت سے آگاہ کریں۔

میر انیس

(حالاتِ زندگی)

میر ببر علی انیسؔ، میر خلیق کے بیٹے تھے۔ ۱۸۰۲ء میں شہر فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میر امامی ہرات سے شاہجہان کے عہد میں آئے اور دہلی میں آباد ہوگئے۔ شہنشاہ نے سہ ہزاری منصب عطا کیا۔ مختلف حوادث کے باعث سلطنت مغلیہ کا انتشار شروع ہوا تو میر امامی کے پوتے میر غلام حسین ضاحکؔ اپنے فرزند میر حسنؔ کو، جن کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، ساتھ لے کر فیض آباد پہنچے۔ جب دارالخلافہ لکھنؤ منتقل ہوا تو میر ضاحکؔ اور میر حسنؔ کی آمد و رفت لکھنؤ میں شروع ہوگئی۔ میر حسنؔ کے تین بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک میر خلیقؔ تھے۔ میر انیسؔ انہی کے فرزند تھے۔ میر انیسؔ بیالیس سال کے تھے تو مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے۔

میر انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ میر ضاحکؔ اپنے زمانے کے اچھے شاعر تھے، میر حسنؔ مشہور مثنوی ''سحرالبیان'' کے مصنف اور میر خلیق بلند پایہ مرثیہ نگار تھے۔ اس صنف کو انھوں نے بڑی ترقی دی۔ میر انیسؔ کم عمری ہی میں مشقِ سخن کرنے لگے۔ فارسی اور اُردو کے ہزاروں شعر انھیں یاد تھے۔ ابتداء میں سلام کہا کرتے تھے اور اپنے والد سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

میر انیسؔ کی عظمت یہ ہے کہ وہ جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ انھیں خارجی جزئیات اور داخلی واردات دونوں کی تصویر کشی پر بے مثال قدرت حاصل تھی۔ مناظرِ قدرت اور رزم و بزم کا جو مرقع وہ پیش کرتے ہیں اُس کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہیں۔

صفائیِ کلام، لطفِ زبان، چاشنیِ محاورہ، خوبیِ بندش، حسنِ اسلوب، مناسبِ مقام، طرزِ ادا اور سلسلہ کی ترکیب میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کی زبان لکھنؤ میں سند مانی جاتی تھی۔ جس طرح انیسؔ کا کلام لاجواب ہے۔ اسی طرح ان کے پڑھنے کا انداز بھی بے مثال تھا۔ انیسؔ کا مشاہدہ اس قدر ہے کہ اُردو کا کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہیں۔ تخیل کی کارفرمائیاں اپنی بہترین شکل میں انیس کے کلام میں ملتی ہیں۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

غربت

(میر ببر علی انیس)

مقاصدِ تدریس

- اُردو شاعری میں صنف نظم کی ہیت سے آگاہی دینا۔
- نظم میں منظر نگاری سے روشناس کروانا۔
- اُردو شاعری میں میر انیس کے اندازِ کلام سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو بتا دینا کہ نظم میں شاعر کی غربت سے مراد بے وطنی ہے۔

الفاظ و تراکیب

درمانده	رنج و محن	نشیمن	دشت نوردی	دھیان
غم فرقت	غریب الوطنی	راحلہ وزاد	مثل جرس	چھالے

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہو پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگ غم فرقت دل نازک پر گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ وزاد
جاتی نہیں افسردگیٔ خاطر ناشاد
جب عالم تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل، مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اِک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ملتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ملتی

دُکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی کبھی بیٹھے، تو اُٹھاتا نہیں کوئی

کتنے ہیں مسافر کہ نہ پھر آئے سفر سے
جنگل میں عزیزوں کو اَجل لے گئی گھر سے
رُک جاتی ہے شمشیر کی ضربت تو سپر سے
ساعت وہ اَجل کی ہے کہ ٹلتی نہیں سر سے

کتنے ہیں مسافر کہ تہہ خاک نہاں ہیں
قبریں تو ہیں ویرانے میں بستی میں مکاں ہیں

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا ہی دل اِس رنج ومحن سے
چھٹتا نہیں گھر جان نکل جاتی ہے تن سے

آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام
کرتا ہے سفر قافلہ راحت و آرام
وہ دشت نوردی و غم و صدمہ و آلام
منزل پہ ممکن نہیں راحت کا سرانجام

نیند آتی ہے کب لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

(میر انیس کے مرثیے)

مشق

۱) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مسافر کو سفر میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کیوں؟

ب) جب مسافر کو تنہائی کی حالت میں وطن یاد آتا ہے تو وہ کیا محسوس کرتا ہے؟

ج) نظم کے پانچویں بند میں شاعر کس تمنا کا اظہار کرتا ہے؟

د) مسافر کو منزل پر پہنچنے کے باوجود نیند کیوں نہیں آتی ہے؟

ہ) غربت کی صبح وشام کیسی ہوتی ہے؟

۲) نظم کے اشعار کے مطابق دُرست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) نظم ''غربت'' کا شاعر ہے۔

(i) حفیظ جالندھری (ii) احسان دانش

(iii) جگر مُرادآبادی (iv) میر ببر علی انیس

ب) نظم ''غربت'' میں غربت سے شاعر کی مراد ہے۔

(i) بے وطنی (ii) غریبی

(iii) بے علمی (iv) بے عملی

ج) مسافر کو سفر میں نہیں ملتی ہے۔

(i) خوشی (ii) راحت

(iii) منزل (iv) عزیز و اقارب

د) شاعر کو دورانِ سفر عالم تنہائی میں بہت یاد آتا ہے۔

(i) ماں باپ (ii) بیوی بچے

(iii) وطن (iv) عزیز و اقارب

ہ) ہر گام پہ دل مثل جرس کرتا ہے۔

(i) آہ و بکاہ (ii) فریاد

(iii) خوشی کا اظہار (iv) جنت میں

و) قبریں تو ویرانے میں ہیں مگر اِن کے مکان ہیں۔

(i) گاؤں میں (ii) بستی میں

(iii) شہر میں (iv) محلے میں

ز) کتنے مسافر پھر واپس نہ آئے۔

(i) گھر سے (ii) سفر سے

(iii) پہاڑ سے (iv) دیہات سے

ح) دشمن کو بھی اللہ نہ چھڑائے۔

(i) وطن سے (ii) گھر سے

(iii) عزیزوں سے (iv) ماں باپ سے

۳) نظم ''غربت'' کے اشعار کی روشنی میں ذیل خالی جگہ پُر کریں۔

الف) سنگ غم فرقت دل نازک پر .... ہے

ب) جاتی نہیں افسردگی ....

ج) کتنے ہیں مسافر کہ .... ہیں

د) طائر بھی پھڑکتا ہے ....

ہ) یاد آتا ہے منزل پہ .... اپنا

۴) نظم ''غربت'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۵) نظم ''غربت'' میں شاعر نے مسافر کی جو حالت بیان کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۶) اپنے کسی سفر کی روداد بیان کریں۔

۷) نظم ''غربت'' کے کسی بھی دو بندات کی تشریح کریں۔

۸) درج ذیل تراکیب کے معانی لکھ کر جملوں میں استعمال کریں۔

دلِ نازک۔غریب الوطنی۔خاطرِ ناشاد۔تہہ خاک۔کاہشِ جاں

مرکب مصادر کا بطور معاون فعل استعمال

مرکب مصادر وہ مصادر ہیں کہ جن میں اصل مصدر کے درمیان کوئی لفظ بڑھا دیا جاتا ہے۔اس طرح یہ بطور معاون فعل استعمال ہوتا ہے۔مثلاً پینا سے پی لینا، کہنا سے کہہ دینا، رونا سے رو دینا وغیرہ، مزید کمزور پڑنا، ٹوٹ پڑنا، اُٹھا چاہتا اور ضعیف ہونا وغیرہ مرکب مصادر کا بطور معاون فعل استعمال کی مثالیں ہیں۔

سرگرمیاں

۱) طلبہ سے نظم کے واقعات کی تشریح استحسانی انداز میں لکھوائیں۔

۲) طلبہ سے مرکب مصادر بطور معاون افعال استعمال کروائیں۔

۳) طلبہ کو میر ببر علی انیس کی چند اور نظمیں سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) نظم میں منظر نگاری کی اہمیت بتادیں۔

۲) میر انیس کے اندازِ کلام پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

مرزا سلامت علی دبیر

(حالاتِ زندگی)

مرزا دبیر ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ان کے والد مرزا ملازم حسین لکھنؤ منتقل ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی۔ وہ بے حد ذہین تھے۔ بچپن ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ میر ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی ذہانت کے باعث اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئے۔ بادشاہ اور رؤسائے لکھنؤ ان کے بڑے معتقد تھے۔

دبیرؔ اور انیسؔ تقریباً ہم عمر ہیں۔ ان دونوں نے ایک ہی فضاء میں شعر گوئی اختیار کی۔ اپنی شاعری کو مرثیے تک محدود کیا اور مرثیے کو اُس بامِ عروج تک پہنچایا کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آسکتا۔ دبیرؔ اُردو کے مشہور مرثیہ گو مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں اُن مصائب اور واقعات کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کیا ہے جو حضرت امام حسینؓ اور اہلِ بیت کو کربلا کے میدان میں پیش آئے تھے۔

مرزا دبیرؔ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے بلند پایہ عالم بھی تھے اور تمام مروجہ علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے مضامین اور ان کی شاعری میں عالمانہ شان اور وقار پایا جاتا ہے۔ یہ بات انھیں اپنے دور کے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

مرزا دبیرؔ کی زبان ان کی عالمانہ شان کی نمائندہ اور بہت پر شکوہ ہے۔ مرزا دبیر نے صدہا نئے الفاظ، تراکیب، استعارات اور تشبیہات کو زبان کا حصہ بنایا ہے جو ان کے علمی مرتبہ کا تعین کرتی ہے۔ آخری عمر میں بینائی کمزور ہوئی۔ ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہیں۔

شہادت حضرت علی اصغرؓ

(مرزا دبیر)

مقاصدِ تدریس

- اُردو ادب میں مرثیہ کی روایت اور اہمیت بتانا۔
- اُردو میں مرثیہ نگاری میں مرزا دبیر کا مقام بتانا۔
- طلبہ کو تاریخِ عالم میں واقعہ کربلا کی اہمیت سے روشناس کروانا۔

الفاظ و تراکیب

قضا	اُجلی	ردا	دُرِ نجف	ذوالجلال
آب و تاب	سبطِ مصطفیٰ	عدو	یثرب	

ہاتھوں پہ لے کے اس کو چلے شاہ کربلاؑ
اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا
اصغر پہ ماں نے ڈال دی اُجلی سی اِک ردا

چادر نہ تھی وہ چہرۂ پر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید اَبر کا تھا آفتاب پر

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت کا رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے: کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

یہ کون بے زباں ہے تمہیں کچھ خیال ہے
درِ نجف، ہے بانوے بے کس کا لال ہے
لو مان لو تمہیں قسمِ ذوالجلال ہے
یثرب کے شاہ زادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علیؓ کا تم سے طلب گارِ آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے، ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؓ نے

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں
لی حرملہ نے شانے سے دو ٹانگ کی کماں
ترکش سے چن کے کھینچ لیا تیرِ جاں ستاں
جوڑا کمان تاک کے حلقومِ بے زباں

چھٹتے ہی حلق بچّے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچّہ بلک گیا
سوکھے گلے میں خوں بھرا، دم اَٹک گیا

تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا
ٹوپی گری زمین پہ منکا ڈھلک گیا
ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی، منہ سے انگوٹھے نکل پڑے

منہ آسماں سے شہؑ نے پھرایا کہ کیا ہوا
دیکھا نشانہ تیر کا وہ بے خطا ہوا
یعنی دوچار حلق سے تیرِ جفا ہوا
بچہ تڑپ رہا ہے لہو میں بھرا ہوا
آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں
آگے تو دودھ اُگلتے تھے اب خوں اُگلتے ہیں

(نوحہ کربلا)

مشق

ا) مندرجہ ذیل سوالات کا مختصر جواب دیں۔

الف) شاہ کربلاؑ سے شاعر کس کو مُراد لیتے ہیں اور کیوں؟

ب) شاعر نے کسے یثرب کا شہزادہ کہا ہے؟

ج) حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کس طرح واقع ہوئی؟

د) حضرت علی اصغرؑ کو پیاس کیوں زیادہ لگتی تھی؟

ہ) حضرت علی اصغرؑ دودھ کی جگہ اب کیا اُگلتا تھا؟

و) علیؑ کا پوتا دشمن سے کس چیز کا طلب گار تھا؟

ز) ترکش سے کس نے اور کس مقصد کے لیے دوٹانگ کی کمان کھینچ لی؟

ح) کس کا منکا ڈھلک گیا اور کیوں؟

۲) نظم کے اشعار کی روشنی میں دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نظم ''شہادت علی اصغر'' صنف کے لحاظ سے ہے۔

(i) حمد (ii) نعت

(iii) مرثیہ (iv) قصیدہ

ب) نظم ''شہادت علی اصغر'' کا شاعر ہے۔

(i) میر انیس (ii) سلامت علی دبیر

(iii) محسن کاکوروی (iv) میر تقی میر

ج) نظم ''شہادت علی اصغر'' ہیت میں لکھی گئی ہے۔

(i) رباعی کی (ii) مخمس کی

(iii) مسدس کی (iv) مثنوی کی

د) حضرت علی اصغر کا حضرت علیؑ سے رشتہ تھا:

(i) بھتیجے کا (ii) پوتے کا

(iii) بیٹے کا (iv) نواسے کا

۳) نظم کے اشعار کی روشنی میں ذیل مصرعے مکمل کریں۔

الف) ہاتھوں پہ لے کے .... چلے شاہ کربلاؑ

ب) .... تھی وہ چہرہَ پر آب و تاب پر

ج) پوتا علیؑ کا تم سے ....

د) ہچکی جو آئی مُنہ سے ....

ہ) مُنہ آسمان سے .... نے پھرایا کہ کیا ہوا

۴) دوسرے بند کی تشریح کریں۔

۵) نظم ''شہادت حضرت علی اصغرؓ'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۶) نظم ''شہادت حضرت علی اصغرؓ'' میں جو منظر نگاری کی گئی ہے۔ اُسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۷) ذیل مصرعوں کی وضاحت کریں۔

الف) ؎ کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا

ب) ؎ پوتا علیؓ کا تم سے طلب گار آب ہے

ج) ؎ دیدو کہ اس میں ناموری ہے، ثواب ہے

۸) اُردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں مرزا دبیرؔ کے مقام کا تعین کریں۔

مرثیہ

وہ نظم جس میں کسی مرنے والے کے حالات و اوصاف بیان کیے جائیں۔ اور اس کے مرنے پر رنج والم کا اظہار کیا جائے، مرثیہ کہلاتا ہے۔ یہ صنف سخن عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں آئی ہے۔ اُردو میں مرثیہ نگاری کا تعلق عزاداری سے ہے اور عزاداری اُن رسوم کا نام ہے جو اہلِ بیعت کی شہادت کے بعد رائج ہوئیں۔ مرثیے میں منظر نگاری، جذبات کی عکاسی، نقل و حرکت کا احوال اور لفظی پیکر تراشی کی جتنی مثالیں ملتی ہیں۔ اُردو کی کسی اور صنف سخن میں نہیں ملتی۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو چند نئے متن دے کر ان سے امتحانی سوالات کے جواب تحریر کروائیں۔ اور ان سے عبارت کا عنوان بھی تجویز کروائیں۔

۲) اساتذہ کرام طلبہ سے چند پیشہ وارانہ ضرورتوں کی تحریر پڑھائیں۔

۳) اساتذہ کرام طلبہ کو چند دیگر شعراء کے مرثیے بھی سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو ادب میں مرثیہ کی روایت اور اہمیت سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو تاریخِ انسانی میں واقعہ کربلا کی اہمیت پر لیکچر دیں۔

۳۔ اُردو ادب میں مرثیہ کے حوالے سے مرزا دبیر کے مقام سے آگاہ کریں۔

۴۔ مرزا دبیر کی شاعری کے فنی محاسن پر لیکچر دیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ

(حالاتِ زندگی)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ۱۸۳۷ء میں خواجہ ایزد بخش کے ہاں پانی پت میں پیدا ہوئے۔نو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی محمد ابراہیم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی آ کر غالب کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور کے سرکاری بک ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔ چار برس لاہور میں گزارنے کے بعد دہلی چلے گئے اور اینگلو عربک سکول میں مدرس ہو گئے۔

حالیؔ' سر سید احمد خاں کے نامور رفقاء میں سے ہیں۔انھوں نے اُردو نظم و نثر میں بڑا امتیاز حاصل کیا۔نثر میں مقدمہ شعر و شاعری اور تین بلند پایہ سوانح عمریاں لکھ کر اور شاعری میں مسدس کے علاوہ غزل گوئی کو نئے راستے پر لگا کر اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا...... لاہور میں جدید نظم کی جو تحریک اُٹھی اس کے بانیوں میں حالیؔ بھی ہیں۔

غزل گوئی میں غالبؔ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے بھی اثر قبول کیا۔ان کی غزلیں نئے اور پرانے دونوں طرز کا اظہار ہیں۔انھوں نے نئی غزلوں میں پرانی غزل گوئی کی قابل اصلاح رسموں کو ترک کیا۔

حالیؔ نے سب سے پہلے نیچرل شاعری کا نعرہ لگایا۔جس کا مطلب ایسی شاعری تھا جو مبالغہ اور جھوٹ سے پاک حقیقت پر مبنی ہو اور شاعری کے مضامین ہماری روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہوں۔ایسی شاعری کے لیے سادہ خیالات، الفاظ و بیان لازمی ہے۔مضمون کی بندش چُست اور کلام جوش و ولولہ سے بھرپور ہو۔مولانا حالیؔ نے نیچرل شاعری کا نہ صرف نعرہ لگایا بلکہ اس پر عمل کر کے دکھایا۔اس لیے ان کا اکثر کلام نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

حالیؔ کی غزل میں حقیقت اور جذبات کی سچائی پائی جاتی ہے اور اس پر انھوں نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں بھی زور دیا ہے۔حقیقت سے مراد وہ سچائیاں ہیں جو انسانی عقل و تجربہ سے ثابت شدہ ہوں یا جو انسانی فطرت اور مزاج کے مطابق ہوں۔اسی وجہ سے وہ اپنے کلام میں خیال آرائی اور بیان کی آرائش سے بچنے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

حالیؔ نے سب سے پہلے قومی اور اخلاقی شاعری کی بنیاد رکھی اور اپنے کلام سے ہندوستان کے سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا، اُن میں جذبہ حب الوطنی پیدا کیا اور آزادی کی روح پھونکی۔ حالیؔ کی غزل میں خلوص، سادگی، سچائی، مٹھاس' تہذیب اور شرافت ہر جگہ نمایاں ہے۔۱۹۰۴ء میں ان کی علمی قابلیت اور خدمات کے عوض ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا۔۱۹۱۴ء میں پانی پت میں وفات پائی۔

مسلمانوں کا تابناک ماضی

(مولانا الطاف حسین حالی)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو مسلمانوں کے شاندار ماضی سے روشناس کرانا۔
- طلبہ کو حالی کی شعری عظمت سے متعارف کرانا۔
- طلبہ کو حالی کے عہد میں اُردو نظم کے ارتقاء سے آشنا کرانا۔

الفاظ و تراکیب

گھٹا	بطحا	جویا	طبق	کوہ بیضا
بیت حمرا	ٹیکس	میکدہ	گھاٹ	گمشدہ لال

گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی
پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دُور دُور اِس کی پہنچی
جو ٹیکس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

لیے علم و فن اِن سے نصرانیوں نے
کیا کسبِ اِخلاق روحانیوں نے
ادب اِن سے سیکھا صفاہانیوں نے
کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اِک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ہر اِک میکدے سے بھرا جا کے ساغر
ہر اِک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ حکم پیمبر
کہ حکمت کو اِک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اِسے مال سمجھو

ہر اِک علم کے، فن کے جویا ہوئے وہ
ہر اِک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ
سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر اِک ملک میں اِن کی پھیلی عمارات
ہر اِک قوم نے اِن سے سیکھی تجارت

نہیں اس طبق پر کوئی براعظم — نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم — بناؤں سے ہیں ان کی معمور عالم
سرِکوہ آدم سے تا کوہ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر — جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر — یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
کہ تھے آل عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمین پر نشانی

سمرقند سے اندلس تک سراسر — انہی کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر
سوادِ مراغہ میں اور قادسیوں پر — زمین سے صدا آرہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

(مسدسِ حالی)

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر کے مطابق خدا کی ساری کھیتی کیسے ہری ہوگئی؟
ب) مسلمانوں کے علم وفن کے دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟
ج) مسلمان علم وفن کو اپنا گمشدہ مال کیوں سمجھتے تھے؟
د) شاعر کے مطابق ماضی میں مسلمانوں کی عظمت کے کیا آثار نظر آتے ہیں؟
ہ) شاعر نے جلوہ گستر کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟
و) مسلمانوں کی رصدگاہیں کہاں کہاں موجود تھیں؟
ز) مسلمانوں سے اخلاق کس کس قوم نے سیکھا؟
ح) مختلف اقوام نے مسلمانوں سے تجارت کیوں کر سیکھی؟

۲) ذیل مصرعوں کی مختصر وضاحت کریں۔

الف) گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی

ب) سرکوہ آدم سے تا کوہ بیضا

ج) یہ ہے بیت حمرا کی گویا زبان پر

د) کہ تھے آل عدنان سے میرے بانی

ہ) رہے اِس سے محروم آبی نہ خاکی

و) اِنہی کی رصدگاہیں تھی جلوہ گستر

۳) نظم ''مسلمانوں کا تابناک ماضی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ پر ایک مختصر مضمون تحریر کریں۔

۴) شاعر موجودہ دور کے مسلمانوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

۵) چوتھے بند کی تشریح کریں۔

۶) اُردو نظم گوئی میں الطاف حسین حالؔی کے مقام سے آگاہ کریں۔

رباعی

رباعی عربی کے لفظ ''ربع'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ''چار'' کے ہیں۔ اصطلاح میں رباعی شاعری کی اس صنف کو کہا جاتا ہے جو چار مصرعوں پر مشتمل ہو اور ان چار مصرعوں میں صرف ایک ہی مضمون کا بیان ہو۔ رباعی کا قدیم نام ''ترانہ'' ہے۔ تیسری صدی میں اس کو گانے کے لیے لکھا جاتا تھا اور اسے ''دوبیتی'' بھی کہتے تھے۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے نظم میں موجود حسنِ بیان کی صفتوں کی نشاندہی کرائیں۔
۲) الطاف حسین حالی کی کوئی اور نظم بھی سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو الطاف حسین حالؔی کی اُردو ادب کے لیے خدمات پر ایک سیر حاصل لیکچر دیں۔
۲) الطاف حسین حالؔی کی شعری اور فنی محاسن کی وضاحت کریں۔

اکبر الہ آبادی

(حالاتِ زندگی)

سید اکبر حسین نام اور اکبر تخلص تھا۔ ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کرنے کے بعد سکول میں داخلہ لیا۔ مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا، کچھ دنوں بعد نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے جج مقرر ہوئے۔

اکبر کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ شروع میں قدیم رنگ اختیار کیا مگر جلد ہی شاعری میں جدید رنگ کے موجد بنے اور شہرت پائی۔ ابتدائی شاعری میں فرسودہ مضامین اور تصنع کا رنگ پایا جاتا ہے مگر کچھ عرصہ بعد سادگی اور روانی نظر آنے لگی۔ زبان صاف اور رواں ہے۔

اکبر نے شاعری میں انگریزی الفاظ بڑی خوبصورتی اور بے تکلفی سے استعمال کیے اور انھیں بڑی مہارت سے اپنی ترکیبوں میں کھپاتے تھے۔ غزلوں اور نظموں میں ظریفانہ اور اخلاقی رنگ پایا جاتا ہے جو اُن کی شہرت کا باعث بنا اور اس طرز میں کوئی شاعر اِن کا مقابلہ نہ کر سکا۔

اُنھوں نے انگریزوں کے غلبے اور ہماری اجتماعی زندگی پر مغرب کے دور رس سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی اثرات کو محسوس کیا۔ وہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے خلاف تھے اور اپنے مخصوص مزاحیہ و طنزیہ انداز میں شاعری کے ذریعے قوم کو اِن مضر اثرات سے بچانے کی کوشش کی۔ اِن کا مجموعہ کلام ''کلیاتِ اکبر'' کے نام سے شائع ہوا۔ آخری دور میں شاعری پر تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

اکبر اپنی شاعری میں خاص قسم کے الفاظ منتخب کر کے استعمال کرتے ہیں اور ان سے نہ صرف مزاح پیدا کرتے ہیں بلکہ ان سے طنز کا کام بھی لیتے ہیں۔ ان کا کلام اگرچہ بظاہر ادبی زعفران معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تہہ میں گہرے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ محض ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے اصلاح معاشرہ کا کام بھی لیتے ہیں۔

بحیثیت مصلح ان کی عظمت مسلمہ ہے۔ انھوں نے نئی تہذیب کو اپنے طنزیہ تیروں کا نشانہ بنایا۔ وہ عورتوں کی آزادی اور ان کی اعلیٰ تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ آخری عمر میں بیوی اور جوان بیٹا فوت ہو گئے۔ ان کے غم نے قریب المرگ کر دیا۔ ان کا انتقال ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں ہوا۔

قومی

(اکبر الہ آبادی)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو نظم کے ذریعے مسلمانوں کے تابناک ماضی اور موجودہ حالات سے آگاہی دینا۔
- طلبہ کو اکبر کی شاعری میں 'قومی اور ملی' عنصر سے واقفیت دلانا۔
- طلبہ کو اپنی حالت بدلنے کا شعور دلانا۔
- طلبہ کو اکبر کی شاعری کے فنی اسلوب بتانا۔
- طلبہ کو اکبر کے عہد میں اُردو نظم گوئی کی روایت سے روشناس کرانا۔

الفاظ و تراکیب

گھٹا	مدارج	تعلّی	سوزِ جگر	تگ و دو	شرف
اُوج	آئیں	دیوارِ آہن	عرشِ اعظم	آفاق	

مسلمانو! بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے
تمھارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تعلّی باعث سوز جگر کچھ ہے
تمھیں معلوم ہے کچھ، رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو راہ ترقی سے جدا ہو کر

کوئی آگے نہ تھا تم سے ترقی کی تگ و دو میں
کوئی دس میں چمکتا تھا تو تم ممتاز تھے سو میں
تمھی نے فرق بتلایا تھا سب کو گندم و جو میں
تمھی سے سیکھ کر بنتی تھیں عالم مغربی قومیں
شرف پایا تھا تم نے امتیاز حق و باطل سے
مخالف بھی تمھاری قدردانی کرتے تھے دل سے

تمھاری عزتیں تھیں، اوج تھا، رتبہ تھا، شانیں تھیں
تمھاری بات تھی، احکام تھے، کہنا تھا، آئیں تھیں

تمہارے ذکر میں سرگرم دنیا کی زبانیں تھیں
تمہی تم تھے، زمانے میں تمہاری داستانیں تھیں
غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو
سر تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو

تمہارا اتفاق باہمی دیوارِ آہن تھا
مخالف ایک کا جو تھا وہ گویا سب کا دشمن تھا
تمہاری ہمتوں کا عرش اعظم پر نشیمن تھا
تمہارے ہاتھ میں آفاق کا ہر علم ہر فن تھا
تم اپنی حق پرستی سے دبا لیتے تھے دنیا کو
خدا کے سامنے جھک کر جھکا دیتے تھے اعدا کو

نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ چلن باقی
نہ وہ حسن عمل باقی نہ اب وہ حسن ظن باقی
نہ وہ ذوق ہنر مندی نہ شوق علم و فن باقی
نہ دل میں ہے وہ جوش حُبِ یاران وطن باقی
جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو راحت رسانی کی
توقع کیا اسی پر ہے خُدا کی مہربانی کی

وہ باتیں ہو رہی ہیں جن سے قومیں نامور سیکھو
اُٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے، اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو! ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنی غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

(کلیاتِ اکبر)

مشق

۱۔ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) اکبرالہ آبادی مسلمانوں کو کس طرح اپنی حالت کی طرف متوجہ کرتا ہے؟

ب) دوسری اقوام مسلمانوں کی قدردان کیوں تھیں؟

ج) اکبر مسلمانوں کے اتفاق کو کس چیز سے تشبیہہ دیتا ہے اور کیوں؟

ح) چھٹے بند میں شاعر مسلمانوں کو کیا سیکھنے کی تلقین کرتا ہے؟

د) آخری بند میں شاعر مسلمانوں کو کیا تلقین کرتا ہے؟

و) ''کوئی دس میں چمکتا تھا تو تم ممتاز تھے سو میں'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ہ) پانچویں بند میں شاعر کیوں افسردہ نظر آتا ہے؟

ز) تیسرے بند میں شاعر نے مسلمانوں کے ماضی کی حالت کیوں کر بیان کی ہے؟

۲۔ نظم کے اشعار کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نظم ''قومی'' کا تعلق مسلمانوں کے زمانہ سے ہے:

(i) حال (ii) ماضی (iii) مستقبل (iv) حال اور ماضی

ب) نظم ''قومی'' میں شاعر نظر آتا ہے:

(i) افسردہ (ii) خوش (iii) نااُمید (iv) غمگین

ج) شاعر مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے:

(i) علم سیکھنے کی (ii) جگانے کی (iii) لڑنے کی (iv) مقابلہ کرنے کی

د) نظم ''قومی'' کا شاعر ہے:

(i) نظیر اکبرآبادی (ii) الطاف حسین حالی

(iii) حفیظ جالندھری (iv) اکبرالہ آبادی

ہ) ماضی میں مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا تھا:

(i) اتفاق (ii) نفاق (iii) یک جہتی (iv) اتحاد

۳۔ متن کے مطابق درست کے نشان کی علامت (✓) سے اور غلط کی علامت (✗) سے کریں۔

الف) شاعر مسلمانوں کا حال، ماضی سے بہتر سمجھتا ہے۔ ( )

ب) ماضی میں مسلمان دوسری اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ( )

ج) شاعر مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ( )

د) نظم ''قومی'' ایک مزاحیہ نظم ہے۔ ( )

ہ) ماضی میں دوسری اقوام مسلمانوں کی محتاج تھیں۔ ( )

۴۔ نظم ''قومی'' کے اشعار کی روشنی میں خالی جگہ پُر کریں۔

الف) کدھر آ نکلے ہو راہ.................. سے جُدا ہو کر۔ (ترقی ر۔ علم)

ب) مخالف ایک کا جو تھا وہ گویا سب کا.................. تھا۔ (مخالف ۔ دشمن)

ج) نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ.................. باقی۔ (کردار ر/ چلن)

د) جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو.................. رسانی کی۔ (ایذا ۔ راحت)

ہ) خدا کے واسطے اے نوجوانو!.................. میں آؤ۔ (ہوش ۔ جوش)

۵۔ نظم ''قومی'' کی روشنی میں مسلمانوں کے ماضی اور حال کا موازنہ کریں۔

۶۔ آپ نظم ''قومی'' کے مندرجات سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں۔

۷۔ نظم ''قومی'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۸۔ اکبرالٰہ آبادی کی شاعری کے فنی محاسن کی اُن کی قومی شاعری کی روشنی میں وضاحت کریں۔

تھیسارس (Thesaures)

تھیسارس ایک ایسی کتاب ہے جس میں لغات کو اُن کے ہم معنی الفاظ کی ترتیب سے مرتب کیا جاتا ہے۔ مثلاً

☆ سودمند: فائدہ مند، مفید

☆ طبیعت: مزاج، فطرت، خاصیت

☆ گیان: علم، دانش، واقفیت، عقل، فہم

یہ جدید دور میں طلبہ کو مترادفات سکھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ خصوصاً مقابلے کے امتحانات میں یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔

تھیسارس اور لغت میں فرق یہ ہے کہ تھیسارس میں ایک لفظ ایک ہی دفعہ آتا ہے مثلاً اوپر کی مثالوں میں سود کے مترادف الفاظ میں فائدہ مند اور مفید دوبارہ 'ف' اور 'م' ردیف میں نہیں دہرائے جاتے۔ اسی طرح مزاج، فطرت، خاصیت بھی متعلقہ ردیفوں میں نہیں آتے جبکہ لغت میں مذکورہ تمام الفاظ اپنے اپنے ردیفوں میں بھی دہرائے جاتے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے تھیسارس کا استعمال کروائیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے عدالتی فیصلے اور وکالت نامے سمجھا کر پڑھوائیں۔
۳۔ طلبہ کو اکبر الہ آبادی کی گوئی اور نظم سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو مسلمانوں کے ماضی اور حال سے متعارف کروائیں۔
۲۔ طلبہ کو اکبر الہ آبادی کی شاعری میں قومی اور ملی عنصر پر لیکچر دیا جائے۔
۳۔ طلبہ کو اکبر الہ آبادی کے زمانے میں اُردو نظم گوئی، میں جاری رجحانات سے آگاہ کیا جائے۔

حفیظ جالندھری

(حالاتِ زندگی)

محمد حفیظ نام اور حفیظؔ تخلص تھا۔ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ حفیظؔ نے سب سے پہلے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ مشن سکول جالندھر میں داخل ہوئے۔ پرائمری کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر میں داخلہ لیا۔ مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر تعلیم مزید جاری نہ رکھ سکے۔

اِسی زمانے میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تو گرامیؔ جالندھری کی شاگردی اختیار کی۔ طبیعت موزوں پائی تھی اس لیے جلد ہی عمدہ شعر کہنے لگے۔ گھر والوں کو ان کی شاعری کرنا قطعاً پسند نہ تھا۔ چنانچہ حفیظ گھر سے بھاگ کر ریلوے میں ٹائم کیپر کے طور پر ملازم ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں رسالہ ''اعجاز'' نکالا۔ وہ کچھ عرصے بعد بند ہو گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں حکومت نے آپ کو دہلی میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ کر یہاں مستقل طور پر رہنے لگے۔ افواجِ پاکستان میں مورل آفیسر بن گئے اور ۱۹۶۶ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

حفیظؔ نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ نہایت خوبصورت غزلیں لکھیں۔ انھوں نے اپنا پہلا مجموعہ ''نغمہ زار'' شائع کرایا جو بہت مقبول ہوا اس سے ان کی شاعری کی دُھوم مچ گئی۔ مگر ان کا اصل کارنامہ ''شاہنامہ اسلام'' ہے جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ، فتوحات، طرزِ حکومت اور بہترین اخلاق و انصاف کا تذکرہ شدومد سے کیا گیا۔ پاکستان کا قومی ترانہ اُن کا شاہکار ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی نظمیں لکھیں۔

حفیظؔ نے بڑی شریں، سادہ و سلیس اور عام فہم زبان اور مترنم بحریں استعمال کی ہیں۔ ان کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کا استعمال اپنی مثال آپ ہے۔ کلام میں بے پناہ موسیقیت ہے۔ وہ خود ہمیشہ مشاعروں میں ترنم سے پڑھا کرتے تھے اور اپنے مؤثر اندازِ ترنم سے جلسے پر چھا جایا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں گیتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کا انتقال ۱۹۸۲ء کو لاہور میں ہوا۔

شام

(حفیظ جالندھری)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو شاعری میں منظر نگاری کی اہمیت اور روایت بتانا۔
- طلبہ کو حفیظ جالندھری کی نظم گوئی اور فنی خوبیوں سے آگاہ کرنا۔

الفاظ و تراکیب

غبار	لالہ زار	زریں ایوان	ارغوانی بدلیاں	ظلمات
ردائیں	کُہسار	گھٹا	شفق	ساحرہ

رفتہ رفتہ سرخیوں پر چھا گیا کالا غبار
مٹ گیا رنگِ شفق مرجھا گیا یہ لالہ زار

نُور کے زریں ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے

شام آئی خامشی کا جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں

کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پَر پھیلا دیئے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دیئے

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیوؤں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

کہسار پر اس دم یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے اترا ہوا ہے کارواں

یا گھٹائیں ہیں کہ اُٹھیں، سرد ہو کر جم گئیں
اور یا پھر آندھیاں ہیں چلتے چلتے تھم گئیں

(کلیاتِ حفیظ)

مشق

۱۔ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) نظم میں استعمال ہونے والے مرکب توصیفی کی نشان دہی کریں؟

ب) نظم میں استعمال ہونے والی تشبیہات و استعارات کی نشان دہی کریں؟

ج) دوسرے شعر میں ''نور کے زریں ایوانوں'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

د) شاعر نے نظم میں ''ساحرہ'' کس صفت میں استعمال کیا ہے؟

۲۔ نظم کے اشعار کے مطابق درست جواب کی نشان دہی کریں۔

الف) نظم ''شام'' کا شاعر ہے:

(i) علامہ اقبالؔ (ii) نظیرؔ اکبر آبادی
(iii) حفیظؔ جالندھری (iv) الطاف حسین حالیؔ

ب) نظم ''شام'' ہیئت میں لکھی گئی ہے:

(i) مثنوی (ii) رباعی
(iii) مخمس (iv) مسدس

ج) منظرِ کہسار پر گمان ہوتا ہے:

(i) کارواں کا (ii) میدانِ جنگ کا
(iii) میلے کا (iv) بہار کا

د) پہاڑوں میں گھری ہوئی وادیاں منظر پیش کرتی ہیں:

(i) خوبصورت باغوں کا (ii) قید میں شہزادیوں کا

(iii) بہتے دریاؤں کا (iv) پرندوں کے چھچھالے کا

۳۔ نظم ''شام'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴۔ نظم کے اشعار کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

الف) رفتہ رفتہ سرخیوں پر چھا گیا ....۔ (لالہ زار - کالا غبار)

ب) نُور کے زریں ایوانوں میں .... پڑ گئے۔ (غبار - تالے)

ج) شام آئی خامشی کا .... پھیلائے ہوئے۔ (جال - پَر)

د) بند کلیاں اپنی .... سے لپٹ کر سو گئیں۔ (خوشبو - پتوں)

ہ) اور یا پھر آندھیاں ہیں چلتے چلتے .... گئیں۔ (رُک - تھم)

۵۔ نظم ''شام'' کے پہلے تین اشعار کی تشریح کریں۔

۶۔ نظم کے اشعار کی روشنی میں درست جواب کو علامت (✓) سے اور غلط کو علامت (✗) سے کریں۔

الف) شاعر نے نُور کے زریں ایوانوں کو دن کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

ب) لالہ زار سے شاعر کا مطلب ''باغ و بہار'' ہے۔

ج) شاعر کی گھٹاؤں سے مراد بادل ہیں۔

د) ''کالا غبار'' سے شاعر کی مراد شام ہے۔

۷۔ شاعر نے نظم میں غروب آفتاب کی جو منظر کشی کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ نظم میں کن معنوں میں استعمال ہوئے ہیں؟ مختصر وضاحت کریں۔

کالا غبار - زریں ایوان - رنگ شفق - ارغوانی بدلیاں - شورشیں

تخاطب (Discourse)

عام طور پر اظہارِ خیال، گفتگو، تقریر اور بات چیت وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زبان کے تجزیاتی مقاصد کے لیے تین بنیادی اصطلاحات سانچا (Register)، کینڈا (Genre) اور مُختصر (Discourse)

استعمال کی جاتی ہیں۔ لہٰذا صورتحال کے حوالے سے زبان کی مختلف انواع کو سانچا، ثقافتی تنوع کینڈا اور متنی یا تقریری ضروریات کو محضر یا Discourse کہا جاتا ہے۔ یعنی سانچے اور کینڈے کے حوالے سے زبان کے وسیع تر استعمال کو طرزِ بیان یا محضر کہتے ہیں۔

محضر نہ صرف قواعد کی ساخت بلکہ پیشکش اور زبان کے استعمال کے مختلف انداز کا نام ہے۔ مثلاً قانون کی زبان، صحافتی زبان سے الگ ہے۔ دکان داری کی مختلف ہے اور تدریس کی زبان ان سب سے مختلف۔ بقول ڈاکٹر عطش درانی محضر دراصل سماجی تعامل (Social Interaction) کا انسانی روپ ہے جو مخصوص سانچے میں موزوں رویے کے استعمال پر منحصر ہے۔ محضر کے ذریعہ ایک عام اور علمی زبان کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ Writing Language اور Spoken Language دونوں میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مجازی (ادبی) اور اصطلاحی (علمی) محضر (Discourse) میں گفتگو کروائیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی عبارت کو رفتارِ مطالعہ کے ساتھ پڑھوائیں۔
۳۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کھیلوں اور معاشرتی مسائل پر اخبار کے مدیر/متعلقہ محکمہ کو رپورٹ لکھوائیں۔
۴۔ حفیظ جالندھری کی کوئی اور ایسی نظم طلبہ کو سنائیں جس میں منظر کشی کی گئی ہو۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو شاعری میں منظر نگاری کی اہمیت اور روایت بتائیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کو حفیظ جالندھری کی شاعری کے فنی محاسن اور خوبیوں پر ایک سیر حاصل لیکچر دیں۔

سید محمد جعفری

(حالاتِ زندگی)

سید محمد جعفری ۱۹۰۵ء میں بھرت پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید محمد علی جعفری اسلامیہ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل تھے۔ سید محمد جعفری کی ابتدائی تعلیم و تربیت خالص اسلامی اور مشرقی انداز میں ہوئی۔ قرآن پاک قرأت سے پڑھایا گیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی تعلیم کے لیے گھر پر اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں میٹرک پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی (آنرز) کیا اور نٹیل کالج لاہور سے ادبیاتِ فارسی میں ایم۔اے اور ایم۔او۔ایل کیا۔ رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ مصوری اور خطاطی کا شغل بھی جاری رہا۔ فرصت کے اوقات میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ بھی سیکھ لی۔

پہلے گورنمنٹ سکول جہلم اور پھر سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور میں مدرس ہوئے۔ ۱۹۴۰ء تک گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں لیکچرر رہے۔ اسی سال برطانوی حکومت کے محکمہ اطلاعات ونشریات میں ملازمت اختیار کرلی۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ ۱۹۵۰ء میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں ایران میں پاکستانی سفارت خانے میں بطور کلچرل اتاشی تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر کراچی آگئے۔

سید محمد جعفری کو کالج کے زمانے ہی سے شعر گوئی کا چسکا لگ چکا تھا۔ لیکن اُنھوں نے محسوس کیا۔ کہ ان کا اندازِ سخن اپنے ہم عصر شاعروں سے قدرے مختلف ہے۔ رفتہ رفتہ مزاح گوئی کا عنصر غالب آتا گیا۔

سید محمد جعفری ایک عظیم مزاح گو شاعر تھے۔ لیکن ان کا مزاح برائے مزاح نہیں بلکہ ان کے ہر شعر کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اکبرالٰہ آبادی کے طرز کے شاعر اور طنز و مزاح کے معتبر اور منفرد شاعر تھے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۷۵ء کے درمیانی عرصے میں اُنھوں نے جو کچھ کہا۔ وہ اِن کی شاعری کا بہترین حصہ ہے۔

اُنھوں نے زیادہ تر نظمیں لکھیں۔ پیروڈی اُن کا خصوصی میدان ہے۔ مزاحیہ انداز میں حکمت کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اِن کا مجموعہ کلام ''شوخیِ تحریر'' عوام میں بڑا مقبول ہے۔ وہ صاحبِ طرز شاعر تھے اور مخصوص مترنم لہجے میں کلام پڑھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۶ء میں کراچی میں وفات پائی۔

ایبسٹریکٹ آرٹ

(سید محمد جعفری)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو طنز و مزاح کے مفہوم سے آگاہ کرنا۔
- اُردو ادب میں مزاحیہ شاعری کی روایت بتانا۔
- اُردو ادب میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی اہمیت اُجاگر کرنا۔
- سید محمد جعفری کی شاعری سے واقفیت دلانا۔

الفاظ و تراکیب

ستائش — مسواک — مصور — ٹیڑھی ترچھی — جلوہ فگن

نمائش — ازراہ مروت — نقشِ محبوب — اطفال — بہکانا

ایبسٹرکٹ آرٹ

ایبسٹرکٹ آرٹ سے مراد تجریدی آرٹ ہے۔ جس میں مختلف خیالات اور مناظر کو علامتی طور پر مصور آڑی ترچھی لکیروں میں کینوس پر منتقل کرتا ہے۔ ایبسٹرکٹ آرٹ یعنی تجریدی مصوری ایک ایسی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی مصوری ہوتی ہے جو ایک عام آدمی تو کیا بعض اوقات ایک پڑھے لکھے آدمی کی سوچ اور فکر بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ایسی ہی مضحکہ خیز مصوری پر سید محمد جعفری نے اس نظم میں طنز کیا ہے۔

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی ازراہ مروت بھی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں میں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں میں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی

ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں

نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا
مجھ سے، پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

ٹیڑھی ،ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سُورج کی کرن

ایک تصویر کو دیکھا تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا انناس وہ عورت نکلی

اِس نمائش میں جو اطفال چلے آئے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجے سے لپٹ جاتے تھے

الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اِک خواب تھا دیوانے کا

کیسی تصویر بنائی میرے بہکانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

(شوخیِ تحریر)

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر نے ایبسٹریکٹ (تجریدی) آرٹ کی نمائش کو دیوانے کا خواب کیوں کہا ہے؟

ب) دوسرے شعر کے مطابق شاعر کن دو گناہوں کی سزا پا رہا ہے؟

ج) شاعر نے نمائش میں کس قسم کی تصاویر دیکھی تھیں؟

د) شاعر کے مطابق نمائش میں آنے والے بچے کیوں ڈر رہے تھے؟

ہ) شاعر کے مطابق مصور نے جو نقش محبوب سجا رکھا تھا وہ شاعر کو کیا لگا؟

۲) نظم کے حوالے سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ایبسٹریکٹ آرٹ، کو ذہن میں رکھتے ہوئے درست جواب کا انتخاب کریں۔

(i) سنجیدہ اور ادبی (ii) مزاحیہ و طنزیہ
(iii) تاریخی (iv) علمی

ب) نمائش میں آئے ہوئے بچے تھے:

(i) پُر جوش (ii) خوش
(iii) ڈرے ہوئے (iv) رُو رہے تھے

ج) نمائش میں رکھے ہوئے آرٹ کے نمونے تھے:

(i) بے ڈھنگے (ii) شاہکار
(iii) خوبصورت (iv) بدصورت

د) شاعر نے جس تصویر کو اناس سمجھا تھا وہ تصویر تھی:

(i) مرد کی (ii) بھینس کی (iii) اُونٹ کی (iv) عورت کی

ہ) شاعر کے لیے یہ نمائش ایک تھی:

(i) دیوانے کا خواب (ii) اچھا تجربہ (iii) سزا (iv) سیر

۳) نظم کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴) نظم کے پہلے چار اشعار کی تشریح کریں۔

۵) اگر آپ شاعر کی جگہ ہوتے تو اس نمائش سے کیا تاثر لیتے؟

۶) اس نظم میں کوئی سنجیدہ پہلو تلاش کر کے لکھیں۔

۷) ذیل کے الفاظ و مرکبات کے معانی لکھ کر جملوں میں استعمال کریں۔

از راہ مروت۔ کمالِ فن۔ نقشِ محبوب۔ جلوہ فگن ۔ دیوانے کا خواب

مزاح مزاح پیدا کرنے کے لیے ایک مزاح نگار الفاظ کے ہیر پھیر، واقعات اور حرکات و سکنات سے کام لیتا ہے۔ مزاح میں کسی خاص شخص یا ادارے کو نشانہ تضحیک نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی اس کا مقصد کسی قسم کی اصلاح ہوتا ہے بلکہ یہ صرف فرحت و خوشی پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔

طنز زندگی کے عیوب و نقائص، ماحول کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں، لوگوں کے انفرادی یا اجتماعی عادات، سیاسی، سماجی یا اقتصادی نظام کی کمزوریوں اور خامیوں کو مزاحیہ انداز میں اِس طرح پیش کرنا کہ وہ لوگوں کو بُرا نہ لگے اور اِن کے ذہن اِن خامیوں کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں طنز کہلاتا ہے۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام شاعری میں متعلقہ اصطلاحات کے تحت درج نکات کی شناخت کروائیں۔

۲) اساتذہ کرام طلبہ سے کہہ دیں کہ وہ لائبریری میں چند دیگر اُردو شعراء کی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں تلاش کر کے لکھیں۔

اشاراتِ سبق

۱) طلبہ کو مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کی روایت سے آگاہ کیا جائے۔

۲) طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں سنجیدہ پہلو سے طلبہ کو روشناس کروائیں۔

۳) طلبہ کو سید محمد جعفری کے اسلوب کے بارے میں بتایا جائے۔

سید ضمیر جعفری

(حالاتِ زندگی)

اصل نام ضمیر حسن ہے۔ یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک سکول میں حاصل کی، گورنمنٹ ہائی سکول جہلم سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) سے ایف اے جبکہ اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد صحافت کے کوچے میں قدم رکھا، روزنامہ ''احسان'' کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر دہلی جا کر کلرک بنے، بعد ازاں فوج میں کمیشن حاصل کیا اور میجر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد سی۔ ڈی۔ اے میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ مقرر ہوئے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد پاکستان نیشنل سنٹر میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے تعینات کر دیے گئے۔ کچھ عرصے کے لیے مرکزی وزارت برائے امور مہاجرین میں مشیر برائے تعلقات عامہ بھی رہے۔

سید ضمیر جعفری بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور بھی ہیں، پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ سید ضمیر جعفری سنجیدہ اور مزاحیہ ہر دو طرح کی شاعری کرتے ہیں۔ مگر ان کی شہرت کا باعث ان کی مزاحیہ شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں طنز کی کاٹ بہت مدہم ہے اور مزاحیہ عنصر سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور متوسط طبقے کی نفسیاتی اور معاشی الجھنوں کا نقشہ بڑی مہارت سے کھینچتے ہیں۔ وہ طبقاتی تضادات کی مضحک کیفیت کو اُجاگر کرنے کے مشتاق ہیں اور قاری کو بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مزاحیہ شاعری میں ضمیر جعفری کو پیر و مرشد کا درجہ حاصل ہے۔ مزاح کی تخلیق میں جس سادگی اور روانی سے اُنھوں نے زندگی کے چہرے سے نقاب اُٹھایا ہے اور اِس کے اظہار میں شائستگی اور تہذیبِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ بلا شبہ دورِ حاضر میں اکبرالہ آبادی کے بعد وہ طنز و مزاح کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

دسمبر ۱۹۹۸ء میں ضمیر جعفری اپنے بیٹے کے پاس امریکہ چلے گئے۔ ۱۹۹۹ء میں وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

ریل کا سفر

(سید ضمیر جعفری)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو نظم کے بین السطور معنوں سے لطف اُٹھانے کا طریقہ سکھانا۔
- اُردو ادب میں سید ضمیر جعفری کے مقام سے آگاہی دلانا۔

الفاظ و تراکیب

ملت بیضا	مردم شماری	للکارا	پیچاک	صیقل
لاؤلشکر	عبث	نفوس	روزن	تیر ونشتر

اسی میں ملت بیضا سماجا، کود جا، پھر جا
تری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تیسرا درجا
نہ گنجائش کو دیکھ اس میں نہ تو مردم شماری کر
لنگوٹی کس، خدا کا نام لے، گھس جا، سواری کر
عبث گننے کی یہ کوشش کہ ہیں کتنے نفوس اِس میں
کہ نکلے گا بہر عنوان تیرا بھی جلوس اس میں
وہ کھڑکی سے کسی نے مورچہ بندوں کو للکارا
پھر اپنے سر کا گٹھڑا دوسروں کے سر پہ دے مارا
کسی نے دوسری کھڑکی سے جب دیکھا یہ نظارا
زمین پر آرہا دھم سے کوئی تاج سردارا
یہ سارے کھیت کے گنے کٹا لایا ہے ڈبے میں
وہ گھر کی چار پائی تک اٹھا لایا ہے ڈبے میں
کسی پیچاک میں صیقل کلہاڑا جگمگاتا ہے
کسی روزن سے اک کالا سلیپر منہ کو آتا ہے
کھڑے حقے بمعہ مینار آتشدان کو دیکھو
یہ قوم بے سرو سامان کا سامان تو دیکھو
وہ اک رسی میں پورا لاؤلشکر باندھ لائے ہیں
یہ بستر میں، ہزاروں تیر ونشتر باندھ لائے ہیں

صراحی سے گھڑا، روٹی سے دستر خوان لڑتا ہے
مسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر کے خیال کے مطابق ملت بیضا کا کیا مطلب ہے؟

ب) ریل گاڑی کے مسافروں کی قسمت میں تیسرا درجہ کیوں لکھا گیا ہے؟

ج) شاعر نے گاڑی میں سوار مسافروں کو کس نام سے یاد کیا ہے اور کیوں؟

د) ریل کے مسافر اپنے ساتھ کیا لائے تھے؟

ہ) ''مسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے'' اِس جملے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۲۔ نظم ''ریل کا سفر'' کی روشنی میں ذیل مصرعے مکمل کریں۔

الف) لنگوٹی کس، خدا کا نام لے ....

ب) وہ گھر کی چارپائی تک اُٹھا لایا ہے ....

ج) کسی بیچاک میں صیقل کلہاڑا جگمگاتا ہے ....

د) یہ بستر میں، ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں ....

ہ) مسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے ....

۳۔ نظم کے پہلے چار اشعار کی تشریح کریں۔

۴۔ نظم ''ریل کا سفر'' کا تنقیدی جائزہ لیں۔

۵۔ نظم میں ریل میں سوار مسافروں کی جو بُری حالت بیان کی گئی ہے اُسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۶۔ ذیل الفاظ و مرکبات کو جملوں میں استعمال کریں۔

ملت بیضا، تاجِ سرِ دارا، بیچاک، نفوس، صیقل، روزن۔

۷۔ سید ضمیر جعفری کے مزاحیہ کلام کی روشنی میں اُن کی فنی شاعری پر نوٹ لکھیں۔

قطعہ

قطعہ کے معنی کسی چیز کے حصے، ٹکڑے اور جزو کے ہیں۔ اصنافِ سخن کی اصطلاح میں قطعہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں ایک شعر کا مفہوم دوسرے شعر سے وابستہ ہو اور اس کے مضمون میں تسلسل پایا جائے۔ بعض لوگ قطعہ کے مضامین اور ہیئت کے تسلسل کی وجہ سے اس کو قصیدے کا ٹکڑا سمجھتے تھے اور ان میں کچھ مطابقت اور مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ دراصل یہ صنف قصیدے سے منقطع ہو جانے سے معرضِ وجود میں آئی اور پھر لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کو ''قطعہ'' کہنا شروع کر دیا۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے اُن سے مختلف نوعیت کے مضامین، نثر/نظم لکھوائیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کہہ دیں کہ اگر آپ نے کبھی ریل میں سفر کیا ہے تو اُس کا آنکھوں دیکھا حال لکھیں۔

اشاراتِ سبق

۱) طلبہ کو سید ضمیر جعفری کی شاعرانہ خوبیوں سے آگاہ کیا جائے۔
۲) سید ضمیر جعفری کا چند ہم عصر مزاحیہ شعراء سے موازنہ کیا جائے۔

مرزا محمود سرحدی

(حالاتِ زندگی)

مرزا محمود سرحدی ۱۹۱۳ء میں مردان میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اصل نام عبداللطیف تھا جب کہ قلمی نام محمود سرحدی تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد مقامی سکول میں داخلہ لیا، جہاں سے میٹرک کیا۔ پھر پشاور چلے گئے اور اسلامیہ کالج پشاور سے ایف۔ اے اور بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز فوج کی ملازمت سے کیا مگر جلد ہی اِس سے جی اُکتا گیا اور اِسے چھوڑ کر شعبۂ تعلیم سے منسلک ہوگئے اور گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں مدرس مقرر ہوئے۔ بعد ازاں علامہ مشرقی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور اِسی عہدے سے ریٹائرمنٹ لی۔

طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر کہنے لگے تھے۔ وہ اُردو طنز و مزاح میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اِن کے طنز و مزاح پر مقامی ماحول کا بہت اثر ہے وہ اپنے ارد گرد کی صورت حال کی مضحک تصویریں نہایت مہارت کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں، جن میں طنز کا عنصر گہرا ہوتا ہے۔ مگر اُن کا طنز پُر لطف ہے جو دل پر گراں نہیں گزرتا۔

مرزا محمود سرحدی کا کمال یہ ہے کہ وہ نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں سادگی اور سلاست بدرجہ اُتم موجود ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے اور ہر ایک اُن سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اُن کے خیالات سادہ اور اُسلوب بیان عام فہم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل ہی پر اثر کرتی ہے۔

پشاور کے جریدے ''سنگ دل'' میں طویل عرصہ تک لکھتے رہے اور اِسی جریدے کے ذریعے وہ ادبی حلقوں میں مقبول ہوئے۔ اِن کی زندگی میں اِن کا شعری مجموعہ ''سنگینے'' شائع ہوا، جب کہ دوسرا مجموعہ ''اندیشۂ شہر'' بعد از مرگ ۱۹۷۰ء میں چھپا۔ اِس کے علاوہ کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ محمود سرحدی نے عمر بھر شادی نہیں کی، آخری عمر میں دمے کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں پشاور میں وفات پائی۔

گل بہار کالونی

(مرزا محمود سرحدی)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو مرزا محمود سرحدی کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری سے آگاہی دینا۔
- مرزا محمود سرحدی کی شاعری کی روشنی میں معاشرتی خامیوں کو اُجاگر کرنا۔

الفاظ و تراکیب

پسوؤں | ریلے | ٹھیلے | دُھول | کاشغر
رومیوں کی صورت | پھیر | راجدھانی | مشابہت

اس طرف پسوؤں کے میلے ہیں
اس طرف مچھروں کے ریلے ہیں
جتنی کاریں ہیں اور سڑکوں پر
تیری سڑکوں پہ اتنے ٹھیلے ہیں
اے میری گل بہار کالونی!

کوئی سمجھے کہ اَبر چھایا ہے
خاک اور دھول اتنی اُڑتی ہے
اور یہ معلوم ہی نہیں ہوتا
یہ گلی کس طرف کو مڑتی ہے
اے میری گل بہار کالونی!

بعض گھر رومیوں کی صورت میں
بعض گھر کاشغر کے نقشے پر
بعض گھر تو ہیں کوٹھیوں کی طرح
بعض ہیں میرے گھر کے نقشے پر
اے میری گل بہار کالونی!

دیکھتا ہی نہیں کبھی بالکل
اور کبھی تا بہ دیر دیکھتا ہے
اپنی تقدیر دیکھ کر اکثر
تیری گلیوں کے پھیر دیکھتا ہے
اے میری گل بہار کالونی!

تجھ میں وہ گندا نالہ بہتا ہے
مچھروں کی جو راجدھانی ہے
تیری دوری کو دیکھتا ہوں میں
تو پشاور کا کالا پانی ہے
اے میری گل بہار کالونی!

جس کا بچّہ سکول جاتا ہے لوٹ کر پھر وہ گھر نہیں آتا
آدمی گھر بھی بھول جاتا ہے ہے کسی جا مشابہت اتنی
اے میری گل بہار کالونی!
تجھ میں کلیاں دِلوں کی کھلتی ہیں باوجود اتنے حادثات کے بھی
دونوں چیزیں اکٹھی ملتی ہیں شاعری بھی ہے تجھ میں فارغ بھی
اے میری گل بہار کالونی!

(اندیشہ شہر)

مشق

۱۔ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) بقول شاعر خاک اور دُھول پر کس چیز کا گمان ہوتا ہے اور کیوں کر؟

ب) گل بہار کالونی کے گھر کیوں کر ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟

ج) بچے اپنا گھر کیوں بھول جاتے ہیں؟

د) ''میرے گھر کے نقشے پر'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ہ) اس قدر مسائل کے باوجود شاعر کو گل بہار کالونی کیوں پسند ہے؟

۲۔ نظم گل بہار کالونی کے اشعار کی روشنی میں ذیل مصرعے مکمل کریں۔

الف) تیری سڑکوں پر اتنے .... ہیں (کاریں ۔ ٹھیلے ۔ دکانیں)

ب) کوئی سمجھے کہ .... چھایا ہے (اَبر ۔ سایہ ۔ دُھول)

ج) بعض گھر کاشغر کے .... (صورت میں ۔ نقشے پر ۔ کوٹھیوں کی طرح)

د) مچھروں کی جو .... ہے (راجدھانی ۔ ٹھکانا ۔ گزرگاہ)

ہ) شاعری بھی ہے تجھ میں .... بھی (خاطر ۔ فارغ ۔ قلندر)

۳۔ نظم ''گل بہار کالونی'' کے آخری دو بندات کی تشریح کریں۔

۴۔ نظم ''گل بہار کالونی'' کا خلاصہ بیان کریں۔

۵۔ معاشرے میں موجود خامیوں کی روشنی میں آپ شاعر کے خیالات سے کس حد تک اختلاف یا اتفاق کرتے ہیں؟

٦۔ بے شمار خامیوں کے باوجود ''گل بہار کالونی'' کی کوئی خوبی بیان کریں۔

آزاد نظم

آزاد نظم میں قافیہ، ردیف اور بحر کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اگر شاعر کے ذہن میں کوئی شاندار خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کو نظم میں بیان کرنا چاہتا ہے لیکن وہ قافیہ، ردیف اور بحر کی پابندی کی وجہ سے اسے بیان نہیں کر سکتا اس لیے وہ عمدہ مضمون چھوڑنا پڑتا ہے تو کمی پورا کرنے کے لیے آزاد نظم معرضِ وجود میں آئی تاکہ اس میں اس قسم کی پابندی سے آزادی ہو اور وہ اپنے خیالات واحساسات اور جذبات کو دل کی گہرائیوں سے بیان کر سکے اور کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ مثال کے طور پر پروین شاکر کی ایک آزاد نظم ''مشورہ'' کا ایک بند:

ننھی لڑکی
ساحل سے اتنے نزدیک
ریت سے اپنا گھر نہ بنا
کوئی سرکش موج اُدھر آئی تو
تیرے گھر کی بنیادیں تک بہہ جائیں گی
اور پھر ان کی یاد میں تو
ساری عمر اُداس رہے گی

مذکورہ بالا نظم کے مصرعوں میں وزن تو موجود ہوتا ہے اور وہ بحر میں بھی ہوتے ہیں۔ مگر انھیں ردیف و قافیہ کی آزادی ہوتی ہے اس کے سب مصرعے برابر پیمائش میں نہیں ہوتے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا مصرع ہوتا ہے۔

سرگرمیاں

ا۔ اساتذہ کرام طلبہ سے اصنافِ سخن کے طرزِ بیان کو مختصر سنوائیں۔

٢۔ مرزا محمود سرحدی کی شاعری کا کسی اور مزاحیہ شاعر کی شاعری سے موازنہ کروائیں۔

اشاراتِ سبق

ا۔ طلبہ کو جدید اُردو ادب میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں جاری رجحان سے آگاہ کیا جائے۔

٢۔ اُردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں مرزا محمود سرحدی کا مقام بتایا جائے۔

میر تقی میر

(حالاتِ زندگی)

محمد تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔ ۱۷۲۴ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ اور نو سال کی عمر میں والد انتقال کر گئے۔ اس کے بعد منہ بولے چچا امان اللہ خان نے ان کی پرورش کی، مگر دو سال بعد وہ بھی فوت ہو گئے۔ اس کے بعد بڑے سوتیلے بھائی کے ہاں رہنے لگے، مگر ایک سال بعد انھوں نے گھر سے نکال دیا۔ اس کے بعد میر تقی میرؔ لکھنؤ آ گئے اور مستقل طور پر وہاں رہنے لگے۔

میرؔ کے کلام میں جس قدر سوز و گداز اور درد و غم ہے شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں موجود ہو۔ اس کی وجہ بچپن میں والدین اور منہ بولے چچا کی وفات، بھائیوں کا ناروا سلوک اور وہ محرومیاں، ناکامیاں اور مایوسیاں ہیں، جو اِن کو زندگی میں پیش آئیں۔ اِسی لیے ان کی شاعری غم و آلام اور مصائب کا مجموعہ ہے۔

میرؔ کو اُردو غزل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے غزلیات کے علاوہ قصیدے مثنویاں اور مرثیے بھی لکھے، مگر ان کا اصل میدانِ کمال غزل ہے۔ ان کی غزل کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ جہاں آپ کے خیالات سادہ اور آسان ہیں، وہاں آپ کے الفاظ، تشبیہات، استعارے، محاورات اور تراکیب بھی بے حد سادہ اور آسان ہیں۔ اسی سادگی میں بے حد اثر ہے۔

اس سادگی کے علاوہ میرؔ کی غزل میں جذبے کی سچائی اور خلوص بدرجہ اُتم موجود ہے۔ ان کے کسی شعر میں تکلف، بناوٹ اور تصنع نہیں ہے بلکہ برجستگی اور غضب کی آمد ہے جس میں تسلسل اور روانی پائی جاتی ہے۔ چھوٹی بحروں کی غزلیں خاص طور پر شُستہ اور لاجواب ہیں۔

میرؔ کے ہاں جدت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ معنویت میں موسیقیت بھی ہے اور ترنم بھی۔ مناسب الفاظ کے برمحل استعمال میں میرؔ کی اثر انگیزی کا راز ہے۔ اُردو زبان میں ان کے چھ اور فارسی میں ایک دیوان موجود ہے۔ ۱۸۱۰ء میں انھوں نے لکھنؤ میں وفات پائی۔

غزل (۱)

(میر تقی میر)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو اُردو غزل میں نئی نئی تراکیب سے آشنا کرانا۔
- طلبہ کو اُردو ادب میں غزل گوئی کی روایت بتانا۔
- میر تقی میر کے شعری تغزل اور فنی محاسن سے واقفیت دلانا۔

الفاظ و تراکیب

تاجوری	زندان	شورش	بیدادگری	کارگہ
سوختہ	نوحہ گری	آفاق	سفری	محشر

جس سر کو آج غرور ہے یاں تاجوری کا
کل اِس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اِس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تیری بیداد گری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

(کلیاتِ میر)

غزل (۲)

(میر تقی میر)

الفاظ و تراکیب

طالب دیدار	صورت دیوار	باز	شیب	سماں
رفتگی	نقشِ قدم	پامال	چشم باز ہونا	پست و بلند

تھا عشق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں
سو آئینہ سا صورت دیوار ہوا میں

جب دُور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں

کیا چتے کا فائدہ جب شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

اب پست و بلند ایک ہیں جوں نقش قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

بازار وفا میں سر سودا تھا سبھوں کا
پر بیچ کے جی ایک خریدار ہوا میں

ہُشیار تھے سب دام میں آگئے نہ ہم آواز
تھی رفتگی سی مجھ کو گرفتار ہوا میں

رہتا ہوں سدا مرنے کے نزدیک ہی اب میرؔ
اِس جان کے دشمن سے بھلا یار ہوا میں

(کلیاتِ میرؔ)

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) پہلی غزل کے مطلع میں شاعر نے انسان کے بارے میں کیا کہا ہے؟

ب) پہلی غزل کے مقطع میں شاعر نے ''چراغ سحری'' کا کیا مطلب لیا ہے؟

ج) پہلی غزل کے دوسرے شعر میں شاعر کی ''آفاق کی منزل'' سے کیا مراد ہے؟

د)　دوسری غزل کے مطلع کے مصرعوں کا آپس میں کیا ربط ہے؟

ہ)　دوسری غزل کے پانچویں شعر میں شاعر کس چیز کا خریدار ہوتا ہے؟

۲)　میر تقی میر کی دوسری غزل کو مدنظر رکھتے ہوئے ذیل خالی جگہ پُر کریں۔

الف)　جب دُور گیا قافلہ تب .... ہوئی باز	(چشم۔لب۔عقل)
ب)　پر پیچ کے جی ایک .... ہوا میں	(ہوشیار۔بیدار۔خبردار)
ج)　تھا .... مجھے طالب دیدار ہوا میں	(محبت۔عشق۔فکر)
د)　اِس جاں کے .... سے بھلا یار ہوا میں	(دشمن۔دوست۔عزیز)
ہ)　سونے کا سماں آیا تو .... ہوا میں	(ہوشیار۔خبردار۔بیدار)

۳)　دوسری غزل کے ذیل مصرعوں کی وضاحت کریں۔

الف)　سو آئینہ سا صورت دیوار ہوا میں

ب)　اب پست و بلند ایک ہیں جوں نقش قدم یاں

ج)　بازار وفا میں سر سودا تھا سبھوں کا

۴)　الف) پہلی غزل کے مطلع اور مقطع کے اشعار کی نشاندہی کریں۔

ب)　پہلی غزل میں ردیف اور قافیہ کی نشاندہی کریں۔

۵)　دوسری غزل میں ردیف اور قافیہ کی نشاندہی کریں۔

۶)　دوسری غزل کے مطلع اور مقطع کی نشاندہی کریں۔

۷)　ذیل کو جملوں میں استعمال کریں۔

تاجوری۔ نوحہ گری۔ شیشہ گری۔ آشفتہ سری۔ چراغ سحری

۸)　میر تقی میر کو اُردو غزل کا بادشاہ کیوں کہا جاتا ہے؟

غزل

غزل کے معنی ہیں عشق و محبت کی باتیں کرنا یا عورتوں سے باتیں کرنا۔ شکاری کتوں کے نرغے میں آکر انتہائی بے بسی کی حالت میں ہرن کے منہ سے جو چیخ نکلتی ہے، اِسے بھی غزل کہتے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں

غزل سے مراد شاعری کی وہ قسم ہے جس میں عشق و محبت، ہجر و وصال کا احوال اور محبوب کے حسن کی باتیں ہوں۔ غزل کے اشعار کی تعداد ہمیشہ طاق ہوتی ہے جس کی کم سے کم تعداد پانچ اور بعض ناقدین کے نزدیک زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

غزل کا ہر شعر ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جو معنی و مضمون کے لحاظ سے دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہوتا۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے بشرطیکہ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں۔ بصورتِ دیگر اُسے غزل کا پہلا شعر تو کہا جائے گا، مگر مطلع نہیں کہلائے گا۔ غزل کے آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں بشرطیکہ اس میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ غزل کا آخری شعر تو کہلائے گا مقطع نہیں۔

سرگرمیاں

۱) طلباء کو استحسان کے اُصولوں کے مطابق میر تقی میر کی غزلیات پڑھوائیں۔
۲) اساتذہ کرام طلبہ کو میر تقی میر کی چند دیگر غزلیات بھی سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱) اساتذہ کرام طلبہ کو شعر کی تشریح کرنے کا طریقہ بتائیں۔
۲) طلبہ کو غزل کی ہیئت اور اس کی اہمیت کے بارے میں بتایا جائے۔
۳) اُردو شاعری میں میر تقی میر کے مقام کے بارے میں طلبہ کو بتایا جائے۔

مرزا غالب (بحیثیت شاعر)

(حالاتِ زندگی)

مرزا اسد اللہ نام اور غالب تخلص تھا۔ شروع میں اسد تخلص استعمال کرتے رہے۔ ۱۷۹۶ء میں مرزا عبداللہ بیگ کے ہاں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد چچا کی نگرانی میں پرورش ہوئی۔

مرزا غالب کا لڑکپن عیش و عشرت میں گزرا۔ ان کو کبوتر پالنے، بٹیر لڑانے اور پتنگ اُڑانے کا شوق تھا۔ طبیعت میں شوخی، کھلنڈرا پن، خوداری اور بانکپن بدرجہ اتم موجود تھا۔ چودہ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش کی صاحبزادی سے شادی کی اور آگرہ چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی منتقل ہو گئے۔ اُن کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے مگر سب کے سب بچپن میں فوت ہو گئے۔ پھر بیوی کے بھانجے عارف کو منہ بولا بیٹا بنایا مگر عین جوانی میں وہ بھی فوت ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور فاضل اُستاد شیخ معظم سے حاصل کی۔ بعد میں ملا عبدالصمد سے فارسی زبان اور ادب میں مہارت حاصل کی۔ ان کا شمار اُردو کے صفِ اوّل کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ اُردو نثر میں بھی انھیں بلند مقام حاصل ہے۔ اِس کے علاوہ فارسی میں بھی اُن کا نہایت عمدہ کلام موجود ہے۔ جس پر اُنھیں ہمیشہ ناز رہا۔

غالب کو غزل کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ ایجاز و اختصار، شوخی و ظرافت اور طنز و مزاح ان کی غزلوں کی بنیادی خوبی ہے۔ ان کا ہر شعر لطیف معانی کا حامل ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کا کلام نہایت مشکل ہے جو مقبول نہ ہو سکا۔ مگر جلد ہی غالب کو احساس ہوا اور پھر نہایت سادہ اشعار کہنے لگے جو ان کی مقبولیت کا باعث بنے۔ اس طرح ان کے کلام میں فصاحت، بلاغت اور خوبصورتی پیدا ہو گئی۔ ساتھ ہی مضمون آفرینی، بلند خیالی اور جذبات نگاری نے ان کے کلام کو بے حد مقبول بنا دیا۔ ذوق کے انتقال کے بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے اُستاد رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی میں وفات پائی۔

غزل (۱)

(مرزا غالبؔ)

مقاصدِ تدریس

- اُردو کلاسیکی ادب میں مرزا اسد اللہ غالب کا مقام بتانا۔
- اسد اللہ غالب کی غزل کے فنی محاسن سے روشناس کروانا۔

الفاظ و تراکیب

اندازِ گفتگو	لہو	پیراہن	حاجت رفو	جستجو
ہم سخن	چپک	کریدنا	قائل	رشک

ہر اِک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اَب حاجت رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بدآموزیٔ عدو کیا ہے

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

(دیوانِ غالبؔ)

غزل (۲)

(مرزا اسد اللہ خان غالبؔ)

الفاظ و تراکیب

گمان	نہاں	سُبک دست	سنگ گراں	طبع
خورشید جہاں تاب	بت شکنی	نالے	سخن ور	اندازِ بیان

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغ نہاں اور

یاربّ! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہر چند سُبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیان اور

(دیوانِ غالبؔ)

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) پہلی غزل میں شاعر کی 'حاجت رفو' سے کیا مراد ہے؟

ب) پانچویں شعر میں ''خوف بدآموزیٔ عدو'' سے کیا مراد ہے؟

ج) پہلی غزل کے مقطع میں شاعر نے اپنی آبرو کے بارے میں کیا کہا ہے؟

د) دوسری غزل میں شاعر کے خیال کے مطابق لوگوں کو کس چیز کا دھوکا ہوتا ہے اور کیوں؟

ہ) دوسری غزل کے تیسرے شعر میں شاعر نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے؟

۲) دیئے گئے الفاظ میں سے درست جواب کا انتخاب کر کے خالی جگہ میں لکھیں۔

الف) پہلی غزل کے پہلے شعر میں 'تو' سے مراد .... ہے۔ (محبوب ۔ خودشاعر ۔ رقیب)

ب) پہلی غزل کا پہلا شعر .... ہے۔ (مقطع ۔ مطلع ۔ پہلا شعر)

ج) دوسری غزل میں لفظ 'اور' .... ہے۔ (قافیہ ۔ تشبیہ ۔ ردیف)

د) دوسری غزل میں لفظ ''بازار'' .... ہے۔ (تشبیہ ۔ استعارہ ۔ تلمیح)

۳) پہلی غزل میں گفتگو، رفو، جستجو، عدو، آرزو اور آبرو کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں شعری اصطلاح میں کیا نام دیا جاتا ہے؟

۴) اِن غزلیات سے کم از کم پانچ تراکیب تلاش کریں اور اُنہیں اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

مطلع

مطلع کے لغوی معنی ہیں طلوع ہونے کی جگہ۔ مگر اصطلاح میں مطلع کے معنی غزل یا قصیدے کا وہ پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں مطلع کے دونوں مصرعوں سے غزل کی زمین کا تعین ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ پتا چل جاتا ہے کہ غزل کے باقی اشعار میں ردیف کیا ہوگی اور قافیے کیا ہوں گے۔ اور شعر کہنے کا وزن کیا ہوگا؟ مثلاً ؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

مقطع

مقطع کے لغوی معنی کاٹنے کی جگہ یا کسی چیز کو ختم کرنے کے ہیں۔ مگر اصطلاح میں مقطع سے مراد غزل یا قصیدے کا وہ آخری شعر جس میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہو مقطع کہلاتا ہے۔

مثال: ؎ ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو لائبریری لے جا کر ان سے مختلف تنقیدی کتب کا انتخاب کروائیں
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کو دیوان غالب سے چند اور غزلیات لکھوائیں۔
۳۔ غالب کی شاعری پر لکھی گئی تنقیدی کتب سے طلبہ کو اقتباسات سنوائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱) طلبہ کو اردو ادب میں غالب کے مقام سے آگاہ کیا جائے۔
۲) طلبہ کو غالب کی شاعری میں متنوع موضوعات پر ایک جامع لیکچر دیا جائے۔
۳) طلبہ کو اچھی غزل کی خصوصیات بتائی جائیں۔
۴) طلبہ کو شعری محاسن کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے کا طریقہ سکھایا جائے۔

خواجہ میر دردؔ

(حالاتِ زندگی)

خواجہ میر دردؔ کے والد خواجہ ناصر عندلیب بخارا سے ہجرت کر کے دہلی آئے جہاں میر دردؔ ۱۷۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دہلی میں رہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کے والد زاہد و تقویٰ اور پیری مریدی کے باعث بہت مشہور تھے۔ میر دردؔ انتیس برس کی عمر میں والد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے اور ذاتی تقدس کے سبب بہت جلد مشہور ہو گئے۔

میر دردؔ اُردو کے بہت بڑے صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان کا درجہ اُردو شاعری میں بہت بلند ہے۔ میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سودا کے ہم عصر تھے۔ زبان سادہ اور شستہ ہے۔ ان کا دیوان نہایت مختصر ہے لیکن جو کچھ کہا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ غزلیات کے علاوہ ان کی رباعیات بھی اُردو شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان میں انھوں نے صوفیانہ، عاشقانہ اور اخلاقی مضامین نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے ہیں۔ کلام میں تصوف اور درد کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب نے غزلیں عموماً چھوٹی چھوٹی بحروں میں کہی ہیں۔

آپ کی صوفیانہ شاعری میں دنیا کی بے ثباتی، توکل، فقر و غنا، مسئلہ جبر و قدر اور توحید کے مضامین شامل ہیں۔ آپ نے یہ تمام مضامین سادہ الفاظ اور سادہ انداز میں بیان کیے ہیں۔ آپ کے اشعار میں عشق حقیقی کے علاوہ عشق مجازی کے مضامین بھی موجود ہیں۔ عشق میں پیش آنے والے واقعات و معاملات آپ کے ہاں خوبصورتی سے ملتے ہیں۔ بعض جگہ آپ نے مجازی رنگ میں عشق حقیقی کی باتیں بیان کی ہیں۔

آپ کے اشعار میں کسی قسم کی بناوٹ، تصنع اور تکلف نہیں ہے۔ آپ کی غزل میں زبان کی گھلاوٹ، چاشنی اور لوچ ہے۔ مضمون پاکیزہ، لہجہ باوقار اور خلوص سے بھرپور ہے۔ کلام میں موزوں استعارات اور تشبیہات بھی موجود ہیں۔ انھوں نے ۱۷۸۵ء میں دہلی میں وفات پائی۔

غزل

(خواجہ میر درد)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو خواجہ میر درد کا شاعرانہ مقام بتانا۔
- طلبہ کو خواجہ میر درد کے شعری محاسن سے آگاہ کرنا۔
- خواجہ میر درد کے عہد میں اُردو غزل کا ارتقاء بتانا۔

الفاظ و تراکیب

مغتنم	دید	صدچاک	گل خنداں	توام
زیست	پھولیو	زاہد	موقوف	سم

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے دید جو دم ہے

دل صدچاک ہے گل خنداں
شادی و غم جہاں میں توام ہے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیل گناہِ آدم ہے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جس کے ہاتھ آوے جام سو جم ہے

اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن
جو شجر ہے سو نخل ماتم ہے

دردؔ کا کچھ حال نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) شاعر کا ''دونوں عالم کا ایک عالم'' سے کیا مراد ہے؟

ب) غزل کے مطلع میں شاعر نے زندگی کے بارے میں کیا کہا ہے؟

ج) شاعر زاہد کے غرور کو ''طفیل گناہ آدم'' کیوں کہتے ہیں؟

د) چوتھے شعر کے پہلے اور دوسرے مصرعے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

ہ) مقطع کی تشریح کریں۔

۲) غزل کے اشعار کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) دم۔کم۔عالم۔جم۔غم وغیرہ غزل میں بطور استعمال ہوئے ہیں۔

(i) ردیف (ii) قافیہ

(iii) تشبیہ (iv) استعارہ

ب) غزل کے پانچویں شعر میں ''پھولیو'' سے شاعر کا مراد ہے:

(i) مغرور ہونا (ii) خوش ہونا

(iii) پریشان ہونا (iv) مایوس ہونا

ج) مقطع میں شاعر اپنے حال کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہی ہے:

(i) خوشی (ii) غم اور رونا

(iii) ہنسنا کھیلنا (iv) مایوسی

۳) ذیل اشعار مکمل کریں۔

الف) سلطنت پر نہیں ہے کچھ ....

ب) .... کے ہاتھ آوے جام سو جم ہے

ج) درد کا کچھ حال نہ پوچھو تم ....

د) مت عبادت پہ پھولیو ....

۴) ذیل مصرعوں کی وضاحت کریں۔

الف) دل صد چاک ہے گُل خنداں

ب) جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے

ج) وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

۵) میر دردؔ کے اسلوب سخن کے نمایاں پہلو بیان کریں۔

علم بیان علم بیان ایسے قاعدوں اور ضابطوں کا نام ہے جن کو جان لینے کے بعد ہم ایک ہی بات یا مضمون کو مختلف اور نو بہ نو طریقوں سے ادا کر سکیں اور ان میں سے ہر طریقہ دوسرے سے زیادہ واضح اور مؤثر ہو۔ مثلاً اکبر بہت دلیر ہے۔ انور شیر کی مانند ہے۔

اِن جملوں میں اکبر اور انور کی صفت بہادری کا ذکر ہوا اور اس صفت کا اظہار واضح اور مؤثر انداز میں کیا گیا ہے جو علم بیان کہلاتا ہے۔

علم صنائع بدائع لفظ صنائع صنعت کی جمع ہے۔ اس کے لغوی معنی ''ہنرمندی'' اور ''کاریگری'' کے ہیں۔ بدائع جو بدیع کی جمع ہے۔ جس کے لغوی معنی ''نئی اور انوکھی چیز'' کے ہیں۔ اصطلاحی مفہوم علم بدائع وہ علم ہے جس میں کلام کی خوبیوں پر بحث کی جائے اور کلام کی خوبیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک لفظی خوبیاں اور دوسری معنوی خوبیاں ہیں اور ان کو دوسرے لفظوں صنائع لفظی اور صنائع معنوی کہتے ہیں۔ علم بدیع کے ذریعے کلام میں رنگینی، خوبصورتی اور دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے اور ان طریقوں کے ذریعے تحریر اور تقریر کو بہتر اور مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔

علم صنائع و بدائع کی اقسام: اس کی اقسام حسب ذیل ہیں:

حُسن تعلیل، صنعت تضاد، مراۃ النظیر، تلمیح، صنعت ابہام، صنعت ترصیع، لف ونشر، اشتقاق، مبالغہ، صنعت تکرار

حسن تعلیل: ایسی صنعت کو کہتے ہیں۔ جس میں کسی چیز کی علت بیان کی جائے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس کی علت نہ ہو۔ علت کے معنی ہیں وجہ یا سبب۔ شاعر حضرات اپنے کلام کو خوبصورت بنانے کے لیے حسن تعلیل کا سہارا لیتے ہیں۔

مثال: کہتا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر — پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

یعنی بلبل کے نالوں کی وجہ سے گُل کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ مگر شاعر نے شعر میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے ایک وجہ بیان کر دی ہے۔

حسن تکرار یا صنعت تکرار جب کسی شعر میں ایک لفظ کی تکرار کی جائے یعنی وہ ایک سے زائد بار آئے تو اسے صنعت تکرار یا حسن تکرار کہتے ہیں مثلاً

؎ روتے روتے کون سویا خاک پر ہنستے ہنستے کس کا جھولا رہ گیا

صنعت تضاد جب کسی کلام میں دو ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ مثلاً

؎ منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم

اس شعر میں ''ہنسنا'' اور ''رونا'' ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں اور صنعت تضاد ہیں۔

مراۃ النظیر اس سے مراد کلام میں ایسے الفاظ لانا جن کے معنوں میں خاص مناسبت ہو لیکن یہ مناسبت تقابل اور تضاد کی نہ ہو۔ مثلاً باغ کا ذکر کر کے پھولوں کی رنگینی۔ اُس کی خوشبو، خوبصورتی اور تازگی سبھی کچھ بیان کرنا وغیرہ۔

؎ چلتے ہو تو چمن کو چلیئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے

پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

تلمیح کسی مذہبی، تاریخی داستانی واقعے یا قصے کہانی کو دو تین الفاظ کی مدد سے اشارتاً بیان کرنا تلمیح کہلاتا ہے۔

؎ جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

صنعت ابہام ابہام کے لغوی معنی ''چھپانے اور وہم'' کے ہیں لیکن اصطلاحی مفہوم کلام میں کوئی ایسا لفظ لانا جس کے دو معنی ہوں ایک کے معنی قریب اور دوسرے کے معنی دُور کے ہیں لیکن سننے یا پڑھنے والے کا ذہن معنی قریب کی طرف منتقل ہو۔

مثال:؎ اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں

شاعر کی مدعا بعید کا مفہوم ہے مگر پھول کی مناسبت سے قریبی مفہوم فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔ یہی ایہام کی مثال ہے۔

صنعت ترصیع صنعت ترصیع سے مراد ایک مصرع موزوں کرلیں اور اس کے مقابل کوئی دوسرا مصرع اس طرح لائیں کہ اس مصرعے کا ہر لفظ ترتیب سے پہلے مصرع کا ہم قافیہ اور ہم وزن ہو۔

مثال:؎ ہمت نے میری تجھے اُڑایا غفلت نے تیری مجھے چھوڑ دیا

لف ونشر لفظ لف کے معنی ''لپیٹنا'' اور نشر کے معنی ''پھیلانے اور کھولنے'' کے ہیں۔ اصطلاح میں ان کے معنی ہیں کہ کلام میں کسی ایک بات کا ذکر ترتیب سے کریں پھر اس سے تعلق اور مناسبت رکھنے والی دوسری چیزوں کا ذکر اِسی ترتیب سے کیا جائے تو یہ ''لف ونشر'' کہلاتا ہے۔

مثال: ؎ تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اشتقاق اشتقاق سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا جمع کرنا جو ایک ہی مصدر یا مادے سے بنے ہوں۔

مثال: ؎ میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے اُس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

مبالغہ کلام میں کسی شخص یا چیز کی تعریف یا مذمت اس حد تک کرنا کہ یہ بعید از قیاس ہو۔ تو اس کو مبالغہ کا نام دیا جاتا ہے۔

مثلاً: ؎ کیا نزاکت ہے کہ شاخ گُل سے توڑا کوئی پھول آتش گُل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں

٦) اس غزل میں پانچ صنائع بدائع تلاش کریں۔

سرگرمیاں

١۔ اساتذہ کرام طلبہ کو ایک ایسا ادبی پیراگراف پڑھنے کے لیے دیں جس میں مختلف صنعتوں کا استعمال ہوا ہو اور اُن سے ان صنعتوں کی نشان دہی کرائیں۔
٢۔ اساتذہ کرام کسی بھی مشق میں صنائع بدائع کا استعمال اس طرح کرائیں کہ طلبہ غلط فقرات کی درستی باآسانی کرسکیں۔
٣۔ خواجہ میر درد کی غزلیات میں موجود اصطلاحات کی شناخت کرائیں۔
٤۔ خواجہ میر درد کی چند اور غزلیات سنائیں۔

اشاراتِ سبق

١۔ اُردو ادب میں خواجہ میر درد کے مقام سے آگاہ کریں۔
٢۔ اُردو شاعری میں صوفی شعراء کے کردار پر لیکچر دیں۔

غلام ہمدانی مصحفیؔ

(حالاتِ زندگی)

غلام ہمدانی نام مصحفیؔ تخلص تھا۔ ۱۷۵۱ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۷۶ء میں عالمِ جوانی میں وطن چھوڑ کر دہلی پہنچے اور تحصیلِ علم اور مشقِ سخن میں مصروف ہوئے۔ بزرگانِ دہلی کی صحبتوں میں بیٹھ کر بہت جلد مشہور ہوئے۔ اُس وقت دہلی پر افلاس کا دور دورہ تھا۔ دیگر اہلِ ہنر کے ساتھ مصحفی بھی لکھنؤ چلے آئے۔ لکھنؤ میں ان کے مدِ مقابل انشاء تھے۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کی آپس میں ہنگامہ خیز مسابقت رہی اس مسابقت میں انشاء کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا اور مصحفیؔ کو تلخ زندگی گزارنا پڑی تاہم میرؔ اور سوداؔ کے بعد انھیں اُستادِ فن کا درجہ ملا۔

مرزا سلیمان شکوہ نے ان کا معمولی وظیفہ مقرر کیا۔ جس میں گزر بسر کرنے لگے۔ مگر مفلسی کے باوجود خوش خلقی، خوش مزاجی اور طبیعت کی خداداد موزونیت نے انھیں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ لکھنؤ میں ان کی کافی قدر ہوئی۔

مصحفیؔ کی شہرت زیادہ تر ان کے دواوین اور تذکروں پر مبنی ہے۔ اُردو کے آٹھ دیوان ان کی یادگار ہیں۔ جن میں ہزاروں غزلیں، قطعے، قصائد وغیرہ موجود ہیں۔ مگر ان کا سرمایۂ حیات غزل ہے۔ مصحفیؔ کے کلام میں میرؔ کا سوز و گداز، سودا کی بلند پردازی، درد کی سادگی، جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشاء کا رنگ بھی ملتا ہے۔ غرض مصحفیؔ نے ہر رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔ ان میں بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں۔ ان کے کلام میں ترنم کی کیفیت اکثر موجود رہتی ہے۔

مصحفیؔ کے کلام میں ایک خاص طرز کی نزاکت پائی جاتی ہے۔ یہ صفت خاص طور پر اُن شعروں میں موجود ہے جن میں کوئی حِسی تصویر کھینچتے ہیں یا نفسی واردات کو بیان کرتے ہیں۔ صحت زبان کا وہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں محاورے و روزمرہ کا بڑا فرق ہے۔ مصحفیؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا لیکن ان کی زبان میں دہلی کا لب و لہجہ قائم رہا۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے شعر میں کھپاتے ہیں۔ ساتھ ہی اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مصحفیؔ ایک باکمال شاعر تھے۔ انھیں بہت اچھے شاگرد میسر آئے جو اپنے وقت کے استاد تھے۔ آتشؔ، میر خلیقؔ اور میر دبیرؔ وغیرہ۔ مزاج کے اعتبار سے بڑے متین اور سنجیدہ تھے۔ دردمند دل رکھتے تھے۔ آخری عمر میں مصحفیؔ گوشہ نشین ہوگئے۔ ان کی آخری زندگی بڑی تنگدستی اور حسرت میں گزری۔ مصحفیؔ نے بڑی عمر پائی اور ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

غزل

(غلام ہمدانی مصحفیؔ)

مقاصدِ تدریس

- طلبہ کو استحسان کے اُصولوں سے آگاہ کرنا۔
- مصحفی کے کلام کے فنی اسلوب سے روشناس کروانا۔
- طلبہ کو نئی نئی تراکیب اور اصطلاحات سے آشنا کروانا۔

الفاظ و تراکیب

عدم	دل شاداں	حسرت و ارمان	دشت جنوں	گریباں
پردہ خاک	پردہ رخسار	مہ و تاباں	نہال	دیدہ گریاں

نہ گیا کوئی عدم کو دل شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

باغ وہ دشت جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر

پردۂ خاک میں سو سو رہے جا کر افسوس
پردہ رخسار پر کیا کیا مہ و تاباں لے کر

ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے یہ دیدہ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیراں قفس بادِ صبا
خبر آمد ایام بہاراں لے کر

مصحفیؔ گوشہ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث تخت سلیماں لے کر

(کلیاتِ مصحفیؔ)

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) مطلع کے شعر میں شاعر کیا بتانا چاہتا ہے؟

ب) دوسرے شعر میں شاعر نے ''باغ'' کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

ج) غزل کے تیسرے شعر میں شاعر نے ''مہ و تاباں'' سے کیا مُراد لی ہے؟

د) بقول شاعر ''پردہ خاک'' میں جا کر کون سوئے؟

ہ) شاعر نے مقطع کے شعر میں کیا کہا ہے؟

و) اس غزل میں مستعمل تراکیب کی نشاندہی کریں۔

ز) چوتھے شعر میں شاعر کی ''عالم کو نہال'' کرنے سے کیا مُراد ہے؟

ح) بادِ صبا کیا خبر لے کر آئی؟

۲) غزل کے اشعار کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) غزل کی ردیف ہے

(i) شاداں، ارماں (ii) کر

(iii) لے کر

ب) غزل کے قافیے ہیں

(i) ارماں، گریباں، تاباں (ii) پردہ خاک، اسیراں قفس، تختِ سلیماں

(iii) عبث، حسرت، غزلت

ج) مصحفی گوشہ عزلت کو سمجھ تختِ شہی کیا کرے گا تو عبث تختِ سلیماں لے کر

شعری اصطلاح میں کہلاتا ہے؟

(i) مقطع (iii) تشبیہ

(iv) مطلع

د) نہ گیا کوئی عدم کو دل شاداں لے کر یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

شعری اصطلاح میں ہے:

(i) مطلع (ii) مقطع (iii) لف ونشر

۳) غزل کے آخری دو اشعار کی تشریح کریں۔

۴) ذیل تراکیب کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کے مفہوم واضح ہو جائیں۔

پردہ خاک، بادصبا، دیدہ گریاں، گوشہ عزلت، تخت شہی۔

۵) غزل اور نظم میں فرق واضح کیجئے۔

غزل	نظم
۱) غزل پانچ، سات، نو یا گیارہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔	۱) نظم کے اشعار پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔
۲) غزل صرف عشق ومحبت کے مضامین پر مشتمل ہوتی ہے۔	۲) نظم کا میدان وسیع ہوتا ہے۔ اور فنی لوازمات کی قید بھی کم ہوتی ہے۔
۳) غزل میں ہیت کی پابندی ضروری ہے۔	۳) نظم میں خاص انداز یا ہیت کی پابندی نہیں ہوتی۔
۴) غزل کا ہر شعر الگ مفہوم دیتا ہے۔ اس کا تعلق دوسرے اشعار سے ہونا لازمی نہیں۔	۴) نظم کا ہر شعر دوسرے شعر سے زنجیر کی کڑی کی طرح مربوط ہوتا ہے۔
۵) غزل میں قافیے کی پابندی ضروری ہے۔	۵) نظم میں قافیے کی پابندی ضروری نہیں۔ ہر شعر کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔
۶) غزل میں ردیف کی پابندی ضروری ہے۔	۶) نظم ردیف کے مستقل التزام سے بھی آزاد ہوتا ہے۔
۷) غزل وہ قطرہ ہے۔ جس میں سمندر سمٹ جاتا ہے۔	۷) ہزاروں نظمیں ملکر بھی وہ تاثر پیدا نہیں کرسکتیں جو غزل کا ایک شعر کر جاتا ہے۔

۶) غزل کے اشعار میں جن فنِ صنائع کا استعمال کیا گیا ہے ان کی وضاحت کریں۔

۷) اُردو کلاسیکی غزل کی روشنی میں غلام ہمدانی مصحفی کے کلام کے فنی محاسن بیان کریں۔

لغت میں مجازی معنوں کا استعمال

جب کوئی لفظ اپنے اصلی معنوں کی بجائے غیر حقیقی اور غیر وضعی معنوں میں استعمال ہوتو اس کو مجاز کہتے ہیں۔ جیسے ''یہ کام میرے ہاتھ میں ہے'' اس مثال میں ''ہاتھ'' کا لفظ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس سے مراد ''قدرت'' ہے۔ ''وہ دیکھو! میرا چاند آ گیا'' اس جملے میں چاند اصلی معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ''چاند'' سے مراد ''خوبصورت بیٹا'' ہے۔

۱۔ **مجاز شرعی:** کسی لفظ کو اس کے شرعی معنوں کے علاوہ کسی اور معنوں میں استعمال کرنا مجاز شرعی کہلاتا ہے۔ جیسے صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لیے مخصوص ہے۔ مگر اِسے دُعا کے معنوں میں استعمال کرنا۔ قرآن میں بھی اِس لفظ کو اِس کے مجازی معنوں میں استعمال کرتے ہوئے اللہ ربّ العزت نے فرمایا ''آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی دُعا اِن کے لیے وجہ سکون ہے''۔

۲۔ **مجاز لغوی:** کسی لفظ کو اس کے لغوی معنوں کی بجائے کسی اور مفہوم میں استعمال کرنا مجاز لغوی کہلاتا ہے۔

جیسے: سب پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا (میرؔ)

۳۔ **مجاز عرفی عام:** کسی لفظ کو اس کے عام اصطلاحی معنوں میں استعمال کرنے کی بجائے کسی اور معنوں میں استعمال کرنا مجاز عرفی عام کہلاتا ہے۔ مثلاً حیوان کے معنی جاندار کے ہیں مگر اِس لفظ کو انسان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ''وہ تو پورا حیوان ہے''۔ یعنی بہت غیر مہذب ہے، مجاز عرفی کہلاتا ہے۔

۴۔ **مجاز عرفی خاص:** کسی خاص فرقہ یا گروہ کی اصطلاح کو کسی اور معنی میں استعمال کرنا مجاز عرفی خاص کہلاتا ہے۔ مثلاً حقیقت کا لفظ صوفیا کی ایک خاص اصطلاح ہے لیکن اِسے اصلیت کے معنوں میں استعمال کرنا مجاز عرفی خاص کہلائے گا۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے لغت کا اصطلاحی معنی، سلینگ اور بول چال کے حوالے سے استعمال کروائیں۔
۲۔ اساتذہ طلبہ کے درمیان غزل پر استحسانی لحاظ سے گفتگو اور مباحثہ کروائیں۔
۳۔ طلبہ غلام ہمدانی مصحفی کی چند اور غزلیات بھی اپنی کاپی میں لکھیں۔

اشاراتِ سبق

۱) طلبہ کو اُردو ادب میں غزل کی مقبولیت کی وجوہات بتا دیں۔
۲) طلبہ کو مقطع اور مطلع کا فرق بتائیں۔
۳) طلبہ کو اُردو ادب میں غلام ہمدانی مصحفی کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں بتا دیں۔

نواب مرزا خان داغؔ

(حالاتِ زندگی)

نواب مرزا خان داغؔ ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین نواب لوہارو کے بھائی تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی والدہ نے شہزادہ فتح الملک سے شادی کر لی۔ اُس وقت ان کی عمر تقریباً چھ سات برس تھی۔ یہ بھی والدہ کے ساتھ شاہی قلعہ میں رہنے لگے اور وہیں شہزادوں کے ساتھ تعلیم و تربیت پائی۔

شروع ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ ذوقؔ جیسا اُستاد ملا جن سے اصلاح لیتے رہے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد پہلے رامپور پھر دکن چلے آئے۔ یہاں نظام دکن نواب محبوب علی خان نے اپنا استاد مقرر کیا۔

داغ اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے قصیدے بھی کہے اور مثنویاں بھی لکھیں۔ لیکن ان کی شہرت کا اصل سبب غزل گوئی ہے۔ ان کی زبان فصیح اور سادہ ہے اور بیان میں شوخی اور بانکپن کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ خوبیاں ایسی ہیں جو بہت کم شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ داغ کے کلام کو جس قدر مقبولیت اُردو شاعری میں حاصل ہوئی، بیسویں صدی تک میرؔ اور غالبؔ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

داغؔ نے اپنی شاعری میں روزمرہ اور محاورہ کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں فکر و خیال کی گہرائی اور فلسفیانہ نقطہ نظر بالکل نہیں ملتا۔ وہ عشق و محبت کے شاعر ہیں اور زندگی کو بھی ایک رند کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ داغؔ کے لب و لہجہ میں جوش، تازگی، چہک اور مہک پائی جاتی ہے۔ طنز و مزاح، طعنہ، گدگدی اور پھبتی اُن کی ظرافت کے مختلف رنگ ہیں۔ ان کے کلام میں چٹخارہ ہے۔ اُردو غزل کی روایت میں داغؔ کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ انھوں نے شاعری کے ایک دور کو متاثر کیا۔ اُس زمانے میں داغؔ کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا۔

''گلزار داغ'' آفتاب داغ ''دیوان داغ'' اور ''مہتاب داغ'' اُن کی یادگار تصانیف ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۰۵ء کو دہلی میں ہوا۔

غزل

(نواب مرزا داغ دہلوی)

مقاصدِ تدریس

- کسی بھی ادبی فن پارے میں استعمال کیے گئے الفاظ و اصطلاحاتِ سمجھانا۔
- اُردو کلاسیکی غزل میں داغ کی اہمیت بتانا۔
- داغ دہلوی کی غزل کی خوبیوں اور تراکیب سے طلبہ کو آشنا کروانا۔

الفاظ و تراکیب

دوئی	ثانی	حجابوں	تجلی
جلوہ آراء	تصور	تنہا	پردا

اِن آنکھوں نے کیا کیا تماشہ نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

تجھے دیکھ کر وہ دُوئی اُٹھ گئی ہے
کہ اپنا بھی ثانی نہ پایا نہ دیکھا

اِن آنکھوں کے قربان جاؤں جنھوں نے
ہزاروں حجابوں میں پردہ نہ دیکھا

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ سمجھا نہ پایا نہ دیکھا

وہ کب دیکھ سکتا ہے اُس کی تجلی
جس انسان نے اپنا جلوہ نہ دیکھا

اِسے دیکھ کر اور کو بھی جو دیکھے
کوئی دیکھنے والا ایسا نہ دیکھا

تیری یاد ہے یا ہے تیرا تصور
کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

(دیوانِ داغ)

مشق

۱) ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) اس غزل کے مطلع کے شعر میں شاعر کا ''حقیقت'' سے کیا مراد ہے؟

ب) غزل کے تیسرے شعر میں شاعر کن آنکھوں پر قربان ہونے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

ج) غزل کے پانچویں شعر میں شاعر کے خیال کے مطابق کوئی شخص اُس کے محبوب کی تجلّی کیوں نہیں دیکھ سکتا؟

د) غزل کے مقطع میں شاعر نے 'داغ' کو کبھی تنہا کیوں نہیں دیکھا ہے؟

۲) کالم الف میں دیئے گئے الفاظ کالم ب کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں اور جواب کالم (ج) میں لکھیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
پہلا شعر	مقطع	....
نہ دیکھا	اللہ تعالیٰ	....
آخری شعر	مطلع	....
وہ تھا جلوہ آراء	تخلص	....
داغ	ردیف	....

۳) غزل کے دوسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کریں۔

۴) داغ دہلوی کے شعری محاسن اور فنی خوبیوں پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔

۵) اسلوب داغ کی روشنی میں اُن کے کلام کی خصوصیات مثالوں کے ذریعے بیان کریں۔

قصیدہ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ارادے کے ہیں۔ اس کے لغوی معنی مغز اور گودے کے آتے ہیں۔ چونکہ قصیدے میں شاعر کسی زندہ شخص کی تعریف و توصیف، بہادری، جوانمردی کا تذکرہ پاکیزہ اشعار میں کرتا ہے۔ اس لیے اس صنف سخن کو قصیدہ کہتے ہیں۔

ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ غزل کی مانند ہے اِس کے پہلے شعر کو جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں مطلع کہتے ہیں اور آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ باقی اشعار میں غزل کی طرح ردیف بقافیے کی پابندی کی جاتی ہے۔ قصیدے کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ جسے مقطع کہتے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ میں ادبی مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے انھیں کالج کی لائبریری لے جا کر انتخاب کتب کروائیں اور ساتھ زندگی کے مسائل کے حوالے سے اُن سے تحریری ردِعمل کا اظہار کروائیں۔
۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کو کسی بھی علمی مضمون میں استعمال کیے گئے اصطلاحات کا ادراک کروائیں۔
۳۔ استاد طلبہ کو داغ کی ایک مثنوی اور ایک قصیدہ سنائیں اور طلبہ کو کاپی میں نوٹ کرنے کی ہدایت کریں۔

اشاراتِ تدریس

۱) طلبہ کے سامنے مثنوی اور قصیدے کی وضاحت کریں۔
۲) طلبہ کو تشبیہ اور استعارے کی چند مثالیں بتائیں۔
۳) طلبہ کو اُردو ادب میں داغ دہلوی کے مقام سے آگاہ کیا جائے۔
۴) طلبہ کو داغ دہلوی کی شاعری کی فنی خوبیوں پر ایک سیر حاصل لیکچر دیں۔

فرہنگ

حصہ نثر

نظریہ پاکستان (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ)

الفاظ	معانی
اخوت	بھائی چارہ
الحاد	بے دینی
احساس کمتری	اپنے آپ کو کم تر سمجھنا
استوار کرنا	مضبوط کرنا
اسلامی قدریں	وہ باتیں جنھیں اسلام میں قدر اور احترام سے دیکھا جاتا ہے
انتشار	تتر بتر ہونا، بکھر جانا
باہمی اتفاق	آپس میں اتفاق
چھوت چھات	ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ کم ذات ہندو سے اگر کسی اونچی ذات ہندو کا بدن چھو جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے
حجاز	سرزمین عرب جہاں مکہ، مدینہ آباد ہیں
خود مختیار	آزاد، اختیار رکھنے والا
رواداری	دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنا
زک	نقصان
سنگھٹن تحریک	اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا
شاہ ولی اللہ	دہلی کے معروف عالم دین، معلم، مصلح اور رہنما
شدھی تحریک	ہندو قوم پرستوں نے ایک تحریک چلائی جس کا مقصد ہندو مذہب کی تبلیغ تھی
شیوہ	طریقہ، روش، دستور، ڈھنگ
عمل پیہم	مسلسل کام کرتے رہنا
عملی جامہ پہنانا	عمل کر کے دکھانا

الفاظ	معانی
عمل دخل	اختیار، قبضہ
عناد	دشمنی
غلبہ	قابو پانا، بالادستی
فروغ	چمک، روشنی، ترقی
فریب	دھوکہ
فلاح و بہبود	بھلائی اور اچھائی
قیاس	اندازہ، سوچ، تصور، گمان
قرارداد پاکستان	۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں یہ فیصلہ کرنا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ وطن چاہتے ہیں
مفاہمت	ایک دوسرے کی بات سمجھنا اور مان لینا

گزرا ہوا زمانہ (سر سید احمد خان)

الفاظ	معانی
اپنے تئیں	اپنے آپ
ادھیڑ پن	سوچ بچار، غور و فکر، کشمکش، الجھن
اکیلا پن	تنہائی
بے مروت	بے لحاظ
پاش پاش ہونا	ٹکڑے ٹکڑے ہونا
تسخیر	قبضہ کرنا، فتح کرنا
ٹٹول ٹٹول	تلاش تلاش کر کے، غور سے تلاش کرنا
ٹکٹکی باندھ کر	کسی کی طرف برابر گھورتے رہنا
جوبن	جوانی
ڈراؤنی	خوفناک
رسیلی	خوش وضع
سڈول ڈیل	خوشنما، خوبصورت جسم والا
ساعی	دوڑ دھوپ، کوشش کرنے والا

الفاظ	معانی
کج خلقی	بدمزاجی، بداخلاقی
کھنڈر	ویرانہ
گھٹا	بادل
گل کر	ختم ہو کر
لڑکپن	بچپن اور جوانی کے درمیان کا زمانہ
مبنی	مشتمل
مکتب	سکول
نورانی چہرہ	روشن چہرہ
ولولہ	جوش، جذبہ، اُمنگ، شوق

نئی دہلی کی ایک تعمیر (مولوی ذکاء اللہ)

الفاظ	معانی
آرکی ٹیکچر	نقشہ نویسی
استوائی	خط استواء کا علاقہ
افتادہ	تھکا ہوا، ناکارہ، دور
اہتمام	انتظام، التزام
اسپ بادرفتار	ہوا کی رفتار سے دوڑنے والا گھوڑا، تیز چلنے والا گھوڑا
پردہ نشیں	پردے میں رہنے والی چیز، عورت
حسانت	خوبصورتی
حصار	گھیرا، چاردیواری
دایہ گیری	بچے کی پرورش کرنے والی خاتون
سبقت	برتری
سعی	کوشش
شملہ	ہندوستان کا ایک صحت افزاء مقام
طاری ہونا	چھا جانا، غلبہ پانا
علت	برائی، خامی
طاقچہ	دیوار میں بنی الماری
فیض رسانی	فائدہ پہنچانا

الفاظ	معانی
قلعہ معلیٰ	بلند قلعہ، مغلیہ دور کا بنا ہوا قلعہ
قطعہ زمین	زمین کا ٹکڑا
گدڑی	لباس جس میں کافی پیوند لگے ہوں، وہ بازار جس میں ہر قسم کی پرانی چیزیں بکتی ہیں
گراں قیمت	قیمتی
محاذات	مساوی، برابری، مقابلہ، آمنے سامنے
نعمت عظمیٰ	بہت بڑی نعمت
ناف شہر	شہر کا درمیان
منطقی دلائل	وہ دلائل جو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرے

ادب کیا ہے؟ (ڈاکٹر سید عبداللہ)

الفاظ	معانی
اختراع	نئی بات نکالنا
ادراک حقیقت	حقیقت کو پہچاننا
انبساط	خوشی، شادمانی
انواع	رنگا رنگ، بھانت بھانت
بالعموم	عام طور پر
تاثراتی	اثر والی
تزکیہ نفوس	نفس کو پاک کرنا
ترکیب	بناوٹ، ساخت
تحلیل	ختم ہونا، کمزور ہونا، ہضم ہو جانا
تفریح نفس	نفس کو خوش کرنا
تمثیلی	مشابہت، تشبیہ، ڈرامائی
جامع	مکمل
جلوہ گر ہونا	نمودار ہونا
خودنوشت	خود لکھنا
ارجوزہ	قدیم عربی صنفِ شاعری جس میں مدح سرائی کی جاتی تھی

الفاظ	معانی
فنون لطیفہ	دلچسپ باتوں کی کاریگری
قوت مخترعہ	تخلیق والی قوت
حاوی ہونا	قابو پانا، غلبہ پانا

تنقید میں توازن (ڈاکٹر عبادت بریلوی)

الفاظ	معانی
استوار	مضبوط، محکم
اضطراری	پریشانی کا عالم
امتزاج	آمیزش، ہم آہنگی
برانگیختہ	آپے سے باہر ہونا، انتہائی غصے میں آنا
تخلیق	پیدا کیا گیا
جبلت	فطرت، اصلی طبیعت
جمالیاتی	خوبصورتی، حُسن
شعور	عقل، فکر
ظہور پذیر ہونا	ظاہر ہونا
فیاضی	سخاوت
گامزن	تیز چلنے والا
لازم وملزوم	ایک دوسرے سے وابستہ، تعلق، واجب، ضروری
متلاشی	تلاش کرنے والا
مجسم	جسم دار، وہ چیز جس کا طول وعرض ہو
معنویت	باطن پن
مددومعاون	مددگار، ساتھی
منطقی دلائل	وہ دلائل جو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرے
نقاد	تنقید کرنے والا
نظریہ حیات	زندگی کا اصول
ہم آہنگی	امتزاج، آمیزش

آبادی اور منصوبہ بندی (مؤلفین)

الفاظ	معانی
آگاہی ہونا	واقف ہونا
ہم آہنگ	ہم آواز
اقتصادی ترقی	معاشی ترقی
باہمی تعلقات	آپس کے تعلقات
بے تحاشا	بہت زیادہ
تغافل	غفلت، لاپرواہی
ثقافت	کلچر
سبز انقلاب	زرعی انقلاب
سول سوسائٹی	سول سے مراد تمدنی اور سوسائٹی سے مراد معاشرہ اصطلاحاً وہ لوگ جو عوام میں وجود تو رکھتے ہیں مگر کسی منظم پارٹی سے تعلق نہیں ہوتا۔
شعور	عقل، شعور
شرح اموات	اموات کی تعداد
شرح افزائش	زیادہ ہونے اور بڑھوتی کی شرح/تعداد
ماہر معاشیات	معیشت کا تجربہ رکھنے والا
موجب	سبب، وجہ
میڈیا	نشرواشاعت
ملین	دس لاکھ
ورلڈ پاپولیشن ڈے	پیدائش کا عالمی دن
ذہنیات	ذہن سے تعلق رکھنے والی چیزیں
ریختی	وہ نظم جو عورتوں کی بولی میں کہی جائے
سامع	سننے والا
شہر آشوب	وہ نظم جس میں کسی شہر کی پریشانی و بربادی کا ذکر ہو
غنائی شاعری	نغمے والی شاعری
فضائل باطنی	پوشیدہ کمالات، ہنر
قاری	پڑھنے والا
قومی سورما	طاقتور

الفاظ	معانی
کارندہ	محنتی، کام کرنے والا، مزدور کارکن

تباہی، تباہی، تباہی (رتن ناتھ سرشار)

الفاظ	معانی
آفت ڈھانا	مصیبت ڈھانا
آزمودہ کار	تجربہ کار
اپیلٹن	وینشیا کا شوہر
امواجِ بحر	سمندر کی لہریں
بسالت	بہادری، شجاعت
بقا	قیام، دوام، پائیداری، باقی رہنا
بلیغ	اعلیٰ درجے کا کلام، فصیح البیان
بھولا پن	سادگی
پینک	افیون کی اُونگھ، غفلت
تلاطم	طوفان
تشفی	تسلی
تیکھی	سجیلا، البیلی، رعنا، بانکی، ٹیڑھی، ترچھی
ٹاپو	جزیرہ، خشکی کا ٹکڑا جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہو
جان جوکھم میں ڈالنا	جان خطرے میں ڈالنا، مصیبت میں پھنسنا
جگر خراش	دل کو زخمی کرنے والی چیز
چارا	علاج
حزن و ملال	غمگین، رنجیدہ
خفتگانِ تہہ خاک	قبر کے مردے
درم ناخریدا غلام	غلام جو زر خرید نہ ہو
رقیق القلب	نرم دل
زہرہ آب آب ہونا	حوصلہ ہارنا
عروس	سنگھار کی ہوئی دُلہن
غرقاب	غرق ہونا، پانی میں ڈوبا ہوا
لائف بوٹس	بچاؤ کی کشتی، وہ کشتی جو جہاز میں بچاؤ کے وقت استعمال کے لئے رکھی جاتی ہے
موفور	بکثرت، مکمل
ناہنجار	بے ذات، بے طریقہ

آنگن (خدیجہ مستور)

الفاظ	معانی
آنگن	گھر کا صحن
آویزش	ملاوٹ
اشتیاق	شوق، آرزو
جی اُمنڈنا	دل بھر آنا
تیرگی	تاریکی، اندھیرا، جہالت
جھلا اُٹھنا	غصے میں آنا
چنڈو	ایک قسم کا نشہ جو افیون پانی میں پکا کر حقے میں پیا جاتا ہے
دلکشی	دل پسند، خوبصورت، خوب صورتی
دھوم دھام	زور و شور
دھیرے دھیرے	آہستہ آہستہ، آرام سے
روڑے اٹکانا	رکاوٹ پیدا کرنا
سنیچر	بُری گھڑی
فتور	خرابی
کٹر	سخت گیر
کھسیا کر	شرمندہ ہو کر
کٹھ پتلی	بے اختیار شخص
گوڈا	گھٹنا، زانو
مانجھے بٹھانا	دلہن کو شادی سے کئی روز قبل بٹھایا جاتا ہے اور سہیلیاں اُس کے گرد جمع ہوتی ہیں
میکے	عورت کے والدین کا گھر

رستم وسہراب (آغا حشر)

الفاظ	معانی
اُلفت	محبت
پاش پاش ہونا	ٹکڑے ٹکڑے ہونا
جلاد	قتل کرنے والا
حقیر	معمولی، گھٹیا، نکما
خونخوار	خون پینے والا مراد ظالم
دُہائی دینا	واسطہ دینا
زال	رستم کا والد
سام	رستم کا دادا
سجدہ ہائے نیاز	عاجزی کا سجدہ
کریم و رحیم	رحم اور کرم کرنے والا
قہر و غضب	اللہ تعالیٰ کا عذاب اور غضب
قسمت کا ہیٹا	قسمت کا مارا
کوکھ	بطن، پیٹ
ناشاد	ناخوش
گھات	تاک، موقع
گہوارہ	پنگھوڑا
مامتا	ماں کی محبت
موذی حیوان	ظالم درندہ
ناشاد	ناخوش
نریمان	رستم کے خاندان کا فرد
نقارہ	ڈھول، نوبت، مسجد کے اعلان کا ذریعہ
نہاں	پوشیدہ، چھپا ہوا
ہومان، بازمان ہجیر	سہراب کے تین لشکری

مرزا غالب بندر روڈ پر (خواجہ معین الدین)

الفاظ	معانی
بازیچہ اطفال	بچوں کا کھیل، معمولی بات
بساط اُلٹنا	تختہ اُلٹنا، حیثیت ختم ہونا
بھاڑ میں جھونکنا	آگ میں ڈالنا، ضائع کرنا
جماہی لینا/جمائی لینا	انگڑائی لینا، جسم میں ذرا تناؤ آ کر منہ کا کھل جانا
رکھوالی	چوکیداری
سوانگ	روپ
شہر خموشاں	قبرستان
عصا	ڈنڈا
فٹ پاتھ	فٹ پاتھ
قندیل	چراغ، لالٹین
گئوشالہ	گایوں کے رہنے کی جگہ
ناٹک کمپنی	ڈرامہ کمپنی
نیم ہویدا	آدھا کھلا ہوا، نیم عیاں

چلتے ہو تو چین کو چلو (ابنِ انشاء)

الفاظ	معانی
آثار	علامات
آسیبی ماحول	ایسی جگہ جہاں جنون اور بھوتوں کا اثر ہو
آلائش	گندگی
آنچ کرنے سے	ضد پڑنے سے
اندیشہ	ڈر
انواع واقسام	قسم قسم کی
امتدادِ زمانہ	زمانے کی طوالت
اصرار	تکرار
بالائشیں	مراد زیادہ فائدہ
بایں ہمہ	باوجود ان تمام باتوں کے
پایہ تخت	دارالحکومت
تحقیق	حقیقت معلوم کرنا
تسلسل	مسلسل، سلسلہ
تاخت و تاراج	حملہ اور لوٹ مار

الفاظ	معانی
تجسس	جستجو
متمول	دولت مند
چوبی کا	لکڑی کا
خستہ	خراب حال، بوسیدہ
رپٹ	پھسلنا
صغرسنی	کم عمری
غلام گردشیں	برآمدے
لذائذ	لذت کی جمع
مشروب	پینے کا شربت
مقابر	مقبرے کی جمع
نواحات	اِردگرد
نعلین در بغلین	جوتیاں بغل میں ہونا
وحشت	گھبراہٹ، خوف
ہجوم	مجمع

بابل کے کھنڈرات (جمیل الدین عالی)

ارتعاش	کانپنا، کپکپی
استخوان	کھلی، ہڈی
اَن گنت	بے شمار
بامِ عروج	زیادہ بلندی پر
پیچ در پیچ	بل پر بل پڑا ہوا، نہایت پیچیدہ
پاداش	عوض، بدلہ، صلہ
پیوست	جڑا ہوا، چھپا ہوا
جبروت	غرور، تکبر
دہریہ	خدا یا دیوتا کو نہ ماننے والا
دولت و حشمت	امیری اور شان و شوکت
ریشم	ملائم کپڑا، دھاگہ
عشرت خانہ	عیش و عشرت کرنے کا مقام

الفاظ	معانی
عظمت رفتہ	ماضی کی برتری، بڑائی
غلغلے	ہنگامہ، شور و غل
قانون دہندہ	قانون دینے والا
قدامت	قدیم، پرانا
کھنڈر	ویران جگہ، ویران مکان
گستاخ	بے ادب
لبادہ	چغہ، جبہ
مطلق العنان	آزاد، بے باک، خودسر
مخبوط الحواس	پاگل، سودائی
محتسب	حساب لینے والا
مفلوک حال	تباہ حال، خستہ حال
منسوب	نسبت کیا گیا
نقوش	کندہ کی ہوئی چیزیں
سنجاب	چوہے سے ذرا بڑا جانور جس کی ملائم اور ریشم دار کھال کی پوستین بناتے ہیں
شاہانہ نمود	بادشاہوں کی طرح شان و شوکت

خطوطِ غالب (مرزا غالب)

آزردہ	پریشان، غمگین، ستایا ہوا
آشنا	واقف
بلی ماروں	دہلی کے ایک محلے کا نام جہاں غالب رہتے تھے
بہ آئین مناسب	مناسب طریقے سے
پہر دن چڑھے	سورج کا کافی اوپر آنا، تقریباً نو بجے صبح
تردد	اندیشہ، فکر
تلف ہونا	ضائع ہونا
جان سے مرنا	بیماری کے باعث تکلیف میں ہونا
جیوڑا	مرجانا، جان نکلنا
دیباچہ	کتاب کا پیش لفظ

الفاظ	معانی
رفع ہوگیا	دُور ہوگیا
گاہے گاہے	کبھی کبھار
لال کنواں	دہلی کے محلے کا نام
مداح	تعریف
مدار	انحصار، موقوف، بات ٹھہرنا
ناز	فخر
نامہ نگاری	مکتوب نگاری
ننگ آفرینش	مخلوق کی شرم یا مخلوق کے لیے شرم
وسوسہ	اندیشہ، ڈر، خوف
ہرکارہ	ڈاکیا، پوسٹ میں، خط لانے والا

مکاتیبِ اقبال (علامہ اقبال)

الفاظ	معانی
آزمائشی طور پر	تجرباتی طور پر
احباب	حبیب کی جمع، دوست
افاقہ	مرض میں بہتری آنا
اسلامی معاشرت	اسلامی طریقے پر رہن سہن
اطمینانِ قلب	دلی سکون
بے فکر	بے پرواہ، آزاد
توفیق	ہمت
جاہ و منصب	شان و شوکت اور مرتبہ
حقائقِ اسلام	اسلام کی سچی باتیں، حقیقت
دل خوش کن	دل کو خوش کرنا
روحانیت	روحی طاقت
رسوخ	رسائی
سعادتِ حج	حج کرنے کی خوش نصیبی
صاحبزادہ	مراد بیٹا
مخلصین	مخلص دوست
مخدوم الملک	قابلِ تعظیم بادشاہ

الفاظ	معانی
نگہداشت	پرورش
نشر و اشاعت	نشر کرنا اور شائع کرنا
علمِ اسلام	اسلام کا جھنڈا
ورثہ	میراث، ترکہ

کلامِ مست توکلی (ڈاکٹر شاہ محمد مری)

الفاظ	معانی
بانبور	اصل تلفظ بمبور ہے، کوہلو کے ایک پہاڑ کا نام ہے
باہم مجمع	یکجا ہو کر
بچنی	تحصیل ڈُکی کے ایک دریا کا نام
ترخان	پہاڑ کا نام
تنکڑی	تحصیل ڈُکی میں گاؤں کا نام
ڈائنٹر	پہاڑ کا نام
رستانی	پہاڑ کا نام
روضہ	مقبرہ
ساعت	گھڑی
سایہ فگن	سایہ کر دینا
کاہان	ضلع کوہلو کی ایک تحصیل کا نام
کپڑی	پہاڑ کا نام
کم آب علاقے	وہ علاقے جہاں کم پانی موجود ہو
گھن گرج	بادلوں کا گرجنا
مانڑکی	مست توکلی کا گاؤں

نیکی اور بدی (سید عابد شاہ عابد)

الفاظ	معانی
امراض	جمع مرض، بیماریاں
اولسی نکلونہ	پشتو زبان کا لفظ مراد عوامی کہانیاں
بیدار	ہوشیار، چوکنا، جاگتا ہوا
بے بنیاد	بے مقصد
بھولا پن	سادگی

الفاظ	معانی
پسینے سے شرابور	پسینے میں بھیگا ہوا
پھولا نہ سمانا	بہت خوش ہونا
تاکید	ہدایت
تانتا	مجمع، بھیڑ، ہجوم
تیکھی	تیز مزاج، البیلی، ٹیڑھی
حامی و ناصر	مددگار، ساتھی
عروس	دلہن۔
حکماء	جمع حکیم، طبیب
جسامت	جسیم ہونا، ڈول ڈیل
جھپٹنا	حملہ کرنا
خفتگان تہہ خاک	زمین کے نیچے سوئے ہوئے لوگ مراد مردے
دست بردار ہونا	الگ ہونا، چھوڑ دینا
دنگ رہ جانا	حیران رہ جانا
حسب معمول	دستور کے مطابق، روزانہ کوئی کام کرنا
سرگرداں	پریشان، آوارہ
لباس تن زیب کرنا	بدن پر پہنا ہوا لباس
مضر	نقصان دہ، زک پہنچانے والا
نشیب و فراز	اونچ نیچ یعنی زمانے کی سختیاں
نیم حکیم	ناتجربہ کار جس سے کام بگڑ جائے

حصہ نظم

حمد (ماہر القادری)

الفاظ	معانی
آبشار	قدرتی طور پر اونچائی سے گرنے والا پانی
آمرزگار	معاف کرنے والا مراد اللہ تعالیٰ
پردہ دار	بھیدی، محرم
پردہ کشا	پردہ یا غیب ظاہر کرنا
تسکین روح	روح کو سکون ملنا
جل شانہٗ	اللہ کی عظمت اور شان بڑی ہے

الفاظ	معانی
صلصل	فاختہ، قمری
طاؤس	مور پرندہ۔
قضا قدر	تقدیر الٰہی، اللہ کی مرضی
کارساز	قادر مطلق، کام بنانے
لیل و نہار	دن اور رات
موج نسیم	صبح کی ٹھنڈی ہوا
مہر و ماہ	چاند اور سورج
نغمہ سنج	گیت گانا
وابستہ	تعلق

نعت (محسن کاکوروی)

الفاظ	معانی
ازل	پیدائش سے/ ابتداء سے
بیان	گفتگو
خوانداده	تعلیم یافتہ
درود	وہ دعا جو حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم پر پڑھی جائے
رُتبہ	درجہ
سراپا	سر سے پاؤں تک
سخن	بات
شاہ مرسلاں	تمام پیغمبروں کے بادشاہ مراد حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم
شب معراج	۲۶ اور ۲۷ رجب کی درمیانی رات جب حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے ساتویں آسمان پر گئے
عرش بریں	وہ آسمان جہاں اللہ تعالیٰ کا تخت ہے
عروج	بلندی
منزل توحید	اللہ تعالیٰ کی واحدانیت، یکتائی
نزول	نازل ہوا، اُترنا
نسخہ	تجویز کی گئی دوا کی پرچی

انجام (نظیر اکبر آبادی)

الفاظ	معانی
اجل	موت
باج	بج گیا، اعلان ہو گیا
بٹ مار	لاٹھی مارنے والا
بن آنا	بننا
پُن	نیکی
تن	جسم
ٹک	ذرا
جی مارنا	دل مارنا، پوری کوشش کرنا
جلتی	چتا میں جلتی ہے
چنتی	فکر
دان	خیرات
گھنتی	جسے گھن، کیڑا لگ جائے
کبڑا	جھکی کمر والا، ضعیف
کمر باندھنا	تیار ہونا
نقارا	ڈھول، اعلان

داستان باغ کی تیاری میں (میر حسن)

الفاظ	معانی
ارغوانی	سرخ رنگ کی شراب
پارچہ	کپڑا
جواہر	جوہر کی جمع، موتی
خیاباں	پھولوں کی کیاری
خانہ باغ	گھر کا باغ، پائیں باغ
دوروں	دروازوں
زمرد	سبز رنگ کا قیمتی پتھر
زربفت	سنہری تاروں سے بنا ہوا
زرنگار	وہ چیز جس پر سنہری کام ہوا ہو

الفاظ	معانی
سائبان	وہ کپڑا جو چھت کے نیچے خوبصورتی کے لئے لگایا جاتا ہے یہاں مراد پردے
شاخ در شاخ	شاخ میں شاخ الجھی ہوئی
گل کاریاں	پھول گاڑھنا
لگن	فانوس
نہال	درخت
محال	مشکل
مرصع	آراستہ
مشامہ	سونگھنے کی قوت

غربت (میر انیس)

الفاظ	معانی
آٹھ پہر	دن رات
افسردگی	غمگینی، اُداسی
آلام	الم کی جمع بمعنی غم، پریشانیاں
اندوہ	غم
تہ خاک	زمین کے نیچے
چھالے	آبلے
درماندہ	تھکا ہوا
سرانجام	بندوبست
سر ٹپکنا	سر مارنا
شُغل	مصروفیت، کام
ضربت	چوٹ
غریب الوطنی	مسافرت، مسافر
فرقت	جدائی
کاہش	فکر
گام	قدم
جان کے لالے پڑنا	مصیبت میں مبتلا ہونا
محن	محنت

الفاظ	معانی
نوردی	گھومنا پھرنا
نشیمن	گھونسلا

شہادت علی اصغرؓ (مرزا دبیر)

الفاظ	معانی
آب وتاب	چمک دمک
اُجلی	صاف ستھری
بلکنا	چیخنا
ترکش	تیر رکھنے کا خول، تیردان
تشنج	جکڑ جانا، عضلات جسمانی کا کھچنے لگنا، جسم کا اکڑ جانا
تیور	چہرے کا انداز، ڈھنگ
تھرا	کانپنا، خوفزدہ ہونا
حلقوم	سینے اور گلے کے درمیان کا گڑھا، حلق
دو تا نگ کی کمان	دو نوک والی کمان
ردا	چادر
رنگ فق ہونا	حیرت میں آنا، کسی خوف کی وجہ سے چہرے کی سرخی جاتے رہنا، چہرہ زرد ہو جانا
سبطؑ	بیٹے/بیٹی کی اولاد یہاں مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیٹی کا بیٹا
سرکانا	ہٹانا
سن	عمر
شاہ کربلا	کربلا کا بادشاہ، مراد حضرت امام حسینؓ
شش ماہہ	چھ ماہ کی عمر
عدو	دشمن
منکا ڈھلک جانا	گردن ٹوٹ کر لٹک جانا
ناگہاں	اچانک
یثرب	مدینہ منورہ

مسلمانوں کا تابناک ماضی (مولانا حالی)

الفاظ	معانی
آثار	نشانیاں
آل عدنان	اولاد، بنی اُمیہ
آبی	پانی میں رہنے والا
اُندلس	سپین
بانی	بنیاد رکھنا
بطحا	مکہ کی وادی
بیت	گھر
بناؤں	عمارتیں
ٹیگس	سپین کی ندی کا نام
جہالت	بے علمی
جویا	تلاش کرنا
رصدگاہ	تجربہ گاہ
خاکی	مٹی کے بنے ہوئے
صفاہانیوں	اصفہان کے لوگ
طبق	زمین
فلاحت	کھیتی باڑی
کسب	سیکھنا
کوہ بیضا	اُندلس کے پہاڑ کا نام
گنگا	ہندوستان کا دریا
مراغہ	آذربائیجان کا شہر

قومی (اکبرالہ آبادی)

الفاظ	معانی
اوج	بلندی، اُونچائی
اعدا	عدد کی جمع، دشمن
بحر و بر	سمندر اور خشکی
تعلّی	شیخی، بڑائی، بلندی
تگ ودو	بھاگ دوڑ، کوشش
حُسن ظن	نیک سوچ، اچھا گمان
حُب	محبت

الفاظ	معانی
حق پرستی	اللہ کو ماننا، سچی بات قبول کرنا
جوش	گرمی، زیادتی
دیوارِ آہن	لوہے کی دیوار، مضبوط رکاوٹ
سوزِ جگر	جگر کا جلنا، افسوس ہونا
سرگرم	مصروف
عرشِ اعظم	بڑا عرش، آسمان بالا
غرور و ناز	فخر، بڑائی کا اظہار
گندم و جو	مراد اچھا اور بُرا
ممتاز	نمایاں
یارانِ وطن	وطن کے لوگ

شام (حفیظ جالندھری)

ایوان	محل، بڑے بڑے محل
ارغوانی	سرخ یا نارنجی رنگ
دم	گھڑی
دیو	جن، بھوت، غیر معمولی قوت رکھنے والی مخلوق
ردائیں	چادریں
ساحرہ	جادوگرنی
شفق	صبح اور شام کے وقت آسمان کے کناروں پر نظر آنے والی سرخی
شورشیں	شور و غوغا، ہنگامے
ظلمات	ظلمت کی جمع، یعنی اندھیرے
کلیاں	بن کھلے پھول
کہسار	پہاڑ
گھٹائیں	سیاہ گھنے بادل
لالہ زار	لالے کا کھیت یا میدان، جہاں لالے کے سرخ کھلے پھول

ایبسٹریکٹ آرٹس (سید محمد جعفری)

الفاظ	معانی
ایبسٹریکٹ آرٹس	تجریدی آرٹ
اطفال	بچے
بہکانے	فریب دینے، دھوکا دینا
تپائی	چھوٹی میز، تین ٹانگوں والی چھوٹی میز
جائزہ	ایک نظر دیکھنا
جلوہ	نظارہ
ستائش	تعریف
فگن	ڈالنا
کمالِ فن	شاہکار
مروت	احسان مندی
نقش	شکل
ورق	کاغذ

ریل کا سفر (سید ضمیر جعفری)

بیضا	روشن، سفید
پیچاک	پیچ و خم
روزن	شگاف، سوراخ
سما جانا	بیٹھ جانا، بھر جانا
صیقل کلہاڑا	تیز اور چمکدار کلہاڑا
عبث	فضول، بیکار
گٹھڑا	کئی چیزوں کو یکجا باندھنا
لنگوٹی	چھوٹی دھوتی
لاؤ لشکر	ہجوم، بھیڑ بھاڑ
مردم شماری	آدمیوں کی گنتی
نفوس	نفس کی جمع، ہستیاں
ملتِ بیضا	روشن، ترقی یافتہ قوم

گل بہار کالونی (مرزا محمود سرحدی)

الفاظ	معانی
ابر	بادل
پسو	ایک زہریلا کیڑا جس کے کاٹنے سے بدن میں کھجلی ہوتی ہے
تا بہ دیر	دیر تک
ٹھیلہ	ہاتھوں سے دھکا دینے والی گاڑی
جا	جگہ
دھول	گرد، مٹی
راجدھانی	دارالحکومت، پایہ تخت
ریلا	پانی کا چڑھاؤ، طغیانی
کاشغر	چین کا ایک شہر
کوٹھی	بنگلہ
مشابہت	مطابقت، شکل، شبیہہ

غزلیات (میر تقی میر)

الفاظ	معانی
آشفتہ سری	دیوانگی، پاگل پن
آفاق	دنیا، کائنات
باز	کھلنا
بیدادگری	ظلم
پامال	تباہ
تاجوری	سر پر تاج مراد بادشاہ
جگر سوختہ	جلا ہوا جگر
جنون	پاگل پن
چشم باز ہوئی	آنکھ کھل گئی
چیتا	ہوشیار ہونا، جاگنا
داور محشر	قیامت کے دن انصاف کرنے والا مراد اللہ تعالیٰ
رفتگی	بے خودی
زنداں	قید خانہ

الفاظ	معانی
سماں	منظر
شورش	ہنگامہ آرائی
شیب	بڑھاپا
صورت دیوار	دیوار کی مانند
کارگہ	کارخانہ
مداوا	علاج
نوحہ گری	ماتم
نقش قدم	پاؤں کے نشان
ہر سفری	ہر مسافر

غزلیات (مرزا غالب)

الفاظ	معانی
انداز گفتگو	گفتگو کا طریقہ
بت شکنی	بت توڑنا، کفر ختم کرنا
بدآموزی	بری باتیں سیکھنے کا ڈر
پیراہن	لباس، کرتہ
حاجت رفو	سلائی کی ضرورت، مرمت کی ضرورت
داغ نہاں	پوشیدہ زخم
رشک	خوبی پیدا کرنا
سبک دست	جلد باز، جلدی عمل کرنے والا
سخنور	اچھی باتیں کرنے والا مراد شاعر
سنگ گراں	بھاری پتھر
خورشید جہاں تاب	دنیا کو روشن کرنے والا سورج
طاقت گفتار	بولنے کی طاقت
طبع	طبیعت
عدو	دشمن
قائل	ماننا
کریدنا	تلاش کرنا
گمان	شک

الفاظ	معانی
لہو	خون
نالے	ندیاں، رونا، دھونا، نالیدن سے
ہم سخن	باہم بات چیت کرنا، ہم کلام ہونا

غزل (میر درد)

الفاظ	معانی
پھولیو	مغرور ہونا
توام	جڑواں
تجھ بن	تیرے بغیر
جام جم	ایران کے بادشاہ جمشید کا تمثیلی پیالہ جس میں ساری دنیا نظر آتی تھی
خیر و شر	نیکی و بدی
دم	سانس، زندگی
دید	ملاقات
زاہد	عبادت گزار شخص
زیست	زندگی
سم	زہر
صد چاک	سینکڑوں زخموں والا
طفیل	ذریعہ
گل خنداں	ہنستا ہوا، پھول کا کھلنا، کھلا ہوا پھول
مغتنم	غنیمت
موقوف	منحصر
نت	ہمیشہ، ہر وقت
نخل ماتم	مردے کا سجا ہوا جنازہ

غزل (غلام ہمدانی مصحفی)

الفاظ	معانی
بادِ صبا	صبح کی ٹھنڈی ہوا
پردہ خاک میں	زیر زمین یعنی قبر میں
پردہ رخسار	چہرے کا پردہ مراد کفن
ثابت	صحیح سالم
تخت سلیمان	حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت جس پر بیٹھ کر آپ ہوا میں اُڑتے تھے
حسرت و ارمان	جو آرزو پوری نہ ہو
دل شاد ماں	خوش و خرم دل
دشت جنون	دیوانگی کا جنگل
دیدہ گریاں	رونے والی آنکھ
سوئے اسیران قفس	پنجرے میں بند قیدیوں کی طرف
عدم	اگلا جہاں، موت کے بعد کی زندگی
گوشہ عزلت	گوشۂ تنہائی
مہ تاباں	چمکدار چاند
نہال	خوش

غزل (مرزا داغ)

الفاظ	معانی
تجلی	روشنی، جلوہ
تنہا	اکیلا
ثانی	نظیر، مثال، دوسرا۔ دوم
تصور	خیال
حجاب	پردہ
دوئی	دو ہونا، شرک، توحید کی ضد

- بڑوں کا ادب کرنا اچھی عادت ہے۔
- سچ بولنا اچھی عادت ہے۔
- علم کی روشنی پھیلاؤ۔
- صفائی نصف ایمان ہے۔
- نیک بنو نیکی پھیلاؤ۔
- چوری کرنا گناہ ہے۔
- جھوٹ بولنا بری بات ہے۔
- والدین کا احترام کرنا چاہیے۔
- صبح سویرے اٹھنا اچھی عادت ہے۔
- اساتذہ کا احترام کرنا چاہیے۔

قومی احتساب بیورو بلوچستان

جملہ حقوق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں

منظور کردہ صوبائی محکمہ تعلیم حکومت بلوچستان کوئٹہ، بمطابق قومی نصاب 2006ء اور نیشنل ٹیکسٹ اینڈ لرننگ پالیسی 2007ء ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم اینڈ ایکسٹینشن سینٹر بلوچستان کوئٹہ بحوالہ مراسلہ نمبر CB/1002-05 مورخہ 07 اکتوبر 2016ء۔ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ اور ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی امدادی کتاب یا گائیڈ وغیرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

قومی ترانہ

پاک سَرزمین شاد بَاد کِشورِ حَسِین شاد بَاد
تُونشانِ عَزمِ عالی شان اَرضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد بَاد

پاک سَرزمین کا نِظام قُوّتِ اُخُوّتِ عوام
قوم، مُلک، سَلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد بَاد منزلِ مُراد

پَرچمِ سِتارہ و ہِلال رَہبرِ تَرقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ اِستِقبَال
سَایۂ خدائے ذُوالجلال

NBD BOOK HOUSE
30142
BTB URDU LAZMI INTER 11 NEW 2021

کوڈ نمبر U-XI/429(NP-2007)2017

سیریل نمبر

سال اشاعت	ایڈیشن	تعداد	قیمت
2021	اول	13000	-/124